لکھنؤ

تعمیرِ حیات

پندرہ روزہ

کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحل ہا

میرا وقت میرے ذاتی کاموں میں بہت کم صرف ہوتا ہے، اور جو کچھ بھی قومی کام کر رہا ہوں اس کا یہ نتیجہ ہے کہ میرے مرض ذیابیطس میں باوجود انسولین کی پانچ پچکاریوں کے قارورے میں شکر آج تک نہیں گھٹی، بلکہ الٹی بڑھ گئی، اور سچ ہے کہ۔ ع

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

ڈاکٹر انصاری صاحب کا بیان ہے کہ اور مریضوں کو افاقہ ہو رہا ہے، مگر باوجود علاج اور پرہیز کے تمہارے مرض میں افاقہ نہ ہونا، بلکہ اس میں زیادتی ہو جانا محض دماغی محنت، تفکرات اور ہواخوری نہ ہونے کے باعث ہے۔

میں اپنے مسلمان بھائیوں سے پوچھتا ہوں کہ وہی مجھے بتائیں کہ میں کیا کروں۔؟ کہاں سے وقت لاؤں کہ ہر وہ کام جسے اور مسلمان چھوڑے بیٹھے ہیں، خود کرنے لگوں۔ میرے اخبارات کی مالی حالت یہ ہے کہ ہر مہینے ایک ہزار روپے کا خسارہ ہوتا ہے۔ اس میں کچھ کمی ہو گئی تھی، مگر گذشتہ دو ماہ میں "کامریڈ" کے پھر چار بار نہ نکلنے اور وقت پر تو کبھی بھی نہ نکلنے کے باعث دوبارہ زیادتی ہو گئی ہے۔ اس کے علاج کیلئے سوائے دو چار احباب کے کسی نے بھی فکر نہ کی، مگر ہر شخص کا تقاضا ہے کہ یہ کرو اور وہ کرو، اور بالخصوص ہندو، مسلمانوں کے جھگڑوں میں نہ پڑوں تو ہندو پرستی کا الزام الگ لگایا جاتا ہے۔

میں اب اپنی قوم سے صاف صاف کہنا چاہتا ہوں کہ جتنا بوجھ میں اٹھا رہا ہوں، اس سے زیادہ بوجھ اٹھانے کی مجھ میں سکت نہیں۔ اگر ہر تعلیم یافتہ مسلمان اس کا پچاسواں حصہ بھی اٹھانے لگے تو مجھے ہر قومی کام سے سبکدوشی حاصل ہو سکتی ہے، اور ہر قومی کام اب سے دس گنا اچھا ہو سکتا ہے، اگر ہندوستان میں ہزار دو ہزار مسلمان بھی اس کا پچاسواں حصہ اٹھانے لگیں تب بھی مجھے کافی آرام مل سکتا ہے اور قومی کام بھی اب سے بہت بہتر ہو سکتا ہے۔

اس وقت قومی کام کرنا، کام کرنا نہیں ہے بلکہ جان مارنا ہے، نہ تندرستی ہی قائم رہ سکتی ہے نہ کام ہی انجام پا سکتا ہے، آج تھک کر اور ایک حد تک مسلمانوں سے مایوس ہو کر یہ حرفِ شکایت زبان پر لایا ہوں، مواخذۂ حشر سے ہر وقت ڈرتا ہوں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سے کہیں زیادہ اس وقت مسلمانوں کے مواخذہ سے ڈر لگتا ہے۔

چند اللہ کے بندوں کے سوا کسی سے مدد نہیں مل رہی ہے مگر اعتراضات کے لئے ہر ایک تیار اور مستعد ہے۔

میں نے ہزاروں، لاکھوں سے اپنی وہ تعریفیں سُنی ہیں جن کا میں کبھی مستحق نہ تھا، اگر آج شکوۂ بے جا سُن رہا ہوں تو اس کی بھی شکایت نہیں ہے، مگر اظہارِ خیالات ضروری ہو چکا تھا اس لئے کیا گیا۔ ع

کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحل ہا

مجھے اپنے متعلق اپنے بھائیوں سے اتنا شکوہ کرنا نہیں ہے جتنا تمام قومی کام کرنے والوں کی طرف سے قوم سے شکوہ کرنا ہے۔ بظاہر قوم نے سمجھ لیا ہے کہ اس کا حق ہے کہ چند اس کے خادم ہر وقت قومی خدمت کئے جائیں اور باقی کچھ نہ کریں، یہ ایک مہلک غلطی ہے اور اس طرح کوئی بھی دیر تک قومی خدمت نہیں کر سکتا قوم کی حالت اسی وقت درست ہو گی جب کہ قوم کے اکثر افراد کچھ نہ کچھ قومی خدمت کرتے رہیں، لیکن آج تو صرف چند افراد کو قومی خدمت کا ٹھیکہ دار سمجھ لیا گیا ہے اور یہی نہیں کہ ان کا شکریہ ادا نہیں کیا جاتا اور ہر شخص ان سے خدمت لینے کو اپنا حق سمجھتا ہے اور اگر وہ اس کی خدمت کی اپنے میں استطاعت نہیں پاتے تو ان سے دست و گریباں ہونے کو تیار ہے۔ جو قوم کے سچے خادم ہیں وہ تو ہر حال میں قوم کی خدمت کئے جائیں گے، مگر قوم کو خود انہیں غلط اصولوں پر کاربند چھوڑ دینا ویسی ہی غلطی ہے جیسی غیر مستحقین کو بھیک دینا۔ وما علینا الا البلاغ

(مولانا محمد علی جوہر)

تعمیر حیات لکھنؤ

باتیں کرتے کرتے ذرا ہم آگے بڑھ گئے، انہوں نے کہا بس میں ذرا آگے قدم رکھوں گا تو فرانس پہونچ جاؤں گا اور وہاں سے واپس آ سکوں گا۔ معلوم ہوا ہے کہ جینوا کے ہوائی اڈہ کا کچھ حصہ فرانس کے حدود میں ہے۔ اور کچھ حصہ سوئزرلینڈ میں، یہ تو ان ملکوں کی حقیقت ہے اگر آپ وہاں بے تحاشا موٹر چلائیں تو آپ ملک کی سرحد پار کر جائیں گے اور آپ کو اس کا احساس بھی نہ ہوگا۔

وسائل سے مالا مال ملک: برعکس اسکے آپ اس ملک کو دیکھیں۔ یہ مدراس، کیرالا اور کشمیر تک گیا ہوں آپ اگر الٰہ آباد سے کالی کٹ جائیں تو آپ کو اس ملک کی حقیقت معلوم ہو جائے، اب اگر اس ملک میں غذائی کمی ہوتی یا اس ملک میں صلاحیت نہ ہوتی۔ یا اس ملک میں قدرتی پیداوار نہ ہوتی یا اس ملک کے لوگ ذہانت سے محروم ہوتے، محنت و صلاحیت سے محروم ہوتے، تو ہمکو تسلی ہو جاتی، اور ہم سوچتے کہ ہماری قسمت میں یہی لکھا ہے، لیکن اللہ کی طرف سے کوئی کمی نہیں ہے اس نے اس ملک کو سب کچھ دیا ہے اسکی جھولی بھر دی ہے اس ملک کا دامن پُر کر دیا ہے اور ایسا بھرا ہے کہ اس کا اٹھانا مشکل ہو گیا ہے اور یہی دولت یہی زرخیزی اس ملک کے لئے مصیبت بنی سکندر کو کون سی چیز اس ملک کی طرف لائی، ترکوں اور مغلوں کو دین کے جذبہ نے اس پر آمادہ کیا تھا میں انکو ماننا ہوں لیکن یہ ملک سونے کی چڑیا تھی ان کا بھی جی چاہتا تھا کہ یہاں جائیں اور خدمت کریں اور اپنی ذہانت کے نمونے دکھائیں۔ اس ملک کی بھی خدمت کریں، تو کیا بیس پچیس برس کی مدت میں یہ دولتیں چھپالی گئیں، وہ کون سی رات تھی کہ کوئی دن تھا، وہ کون سی گھڑی تھی، خدا کے لئے جنتری دیکھ کر بتایا جائے اخبارات کے فائل دیکھ کر بتایا جائے کہ وہ کونسی منحوس رات تھی کہ جسکی صبح کو معلوم ہوا کہ یہاں کی سب دولت ختم ہو گئی ہے اگر ایسا نہیں ہے تو پھر یہ پریشانی کیوں؟ کیا یہ پریشانی اس وجہ سے ہے کہ ملک فقیر ہے، اس ملک میں خاک اڑ رہی ہے، کیا اس وجہ سے کہ یہاں کے لوگ کھانا چاہتے ہیں، پہننا چاہتے ہیں لیکن کمانا نہیں چاہتے۔ نہیں یہ بات نہیں ہے، بلکہ اللہ نے یہاں کھانے پینے کی چیزوں کی فراوانی اسی لئے کی ہے کہ خود کھائیں لیکن اسکے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی کھلائیں خود پہنیں اور دوسروں کو بھی پہنائیں لیکن کیا بات کہ یہاں بیشمار افراد کو دو وقت کی روٹی نصیب نہیں ہوتی، پہننے کیلئے کپڑا نصیب نہیں ہوتے۔

یہ عشق یہ جنوں: صحیح بات یہ ہے کہ دولت کا عشق، دولت کا جنوں لوگوں پر سوار ہے۔ عشق آپ جانتے ہیں کہ اندھا ہوتا ہے ۔۔۔ حکومت حاصل کرنے کا جذبہ بھی غیر قدرتی نہیں ہے۔ میرا یہ کہنا حقیقت پسندی کے بالکل خلاف ہوگا کہ انسان میں حکومت حاصل کرنے کا جذبہ ہی نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن جب حکومت حاصل کرنے کا جذبۂ عشق اس حد تک پہونچ جائے کہ اسے کچھ پرواہ نہ ہو کہ اسکے اس فعل سے ملک پر کیا گزر رہی ہے اور لوگ مر رہے ہیں یا جی رہے ہیں، سارا ملک لاشوں میں تبدیل ہو جائے مگر ہماری کرسی محفوظ رہے، یہ بالکل غیر فطری جذبہ ہے، یہ شہوانی و حیوانی جذبہ ہے، یہ فرد و جماعت اور تمام ملک کو ہلاک کروا تا ہے۔

اگر کوئی حکومت حاصل کرنا چاہتا ہے، اسکے نزدیک ملک کو ترقی دینے کے جو اصول ہیں انہیں بروئے کار لانا چاہتا ہے اور اسے کامیاب بنانا چاہتا ہے اسکے ذریعہ سے اگر اپنے ہموطنوں کی خدمت کرنا چاہتا ہے تو وہ قابل مبارکباد ہے، شوق سے خدمت کرو، لیکن جب اسکے اندر یہ جذبہ جنون اور عشق کی حد تک پہونچ جائے اسمیں انفرادیت اور وہ چیز ترقی کر جائے، انانیت اس میں اسقدر پیدا ہو جائے کہ وہ سب کی نفی کرے۔ اسکے نزدیک اگر کسی انسان کی قیمت ہے تو ووٹر کی قیمت ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہمارے یہاں اگر الکشن کی یہی حالت رہی تو وہ وقت آنے والا ہے جبکہ آدمی کے نزدیک ماں کی عظمت اسی وقت ہوگی بیٹا اسکی قدر اسی وقت کرے گا جب وہ ووٹر ہو اور بیٹے کو محبت کے قابل اسی وقت سمجھا جائیگا جبکہ وہ ووٹر ہو۔ اگر انسان ووٹر نہیں ہے تو بے عمل اور بے منفعت ہے وہ اگر مر جائے تو اسکا کوئی افسوس نہیں ہوگا۔ اب وہ وقت آنیوالا ہے جب کسی کو معلوم ہوگا کہ فلاں محلہ میں فلاں شخص مر گیا ہے تو وہ پوچھیگا کہ وہ میرا ووٹر تو نہیں تھا، اگر معلوم ہوگیا کہ وہ اسکا ووٹر نہیں تھا تو اسکی موت کا اسے کوئی صدمہ نہ ہوگا ۔۔۔ تو جب ساری دلچسپیاں، سارے احساسات سمٹ کر الکشن کی سیاست کا لوجی میں آ جائیں تو انسان اسی کی عینک سے ہر چیز کو دیکھے گا اور اسی کی کان سے ہر چیز کو سُنے گا، اسی کے ہاتھ سے ہر چیز کو چھوئے گا تو پھر اس ملک کے لئے اس سے بڑھکر خطرہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

میں اپنی آواز نہیں پہونچا سکتا: حضرات! مجھے افسوس یہ ہے کہ میں اپنی آواز ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نہیں پہونچا سکتا ہوں میری قوت بھی محدود ہے اور میرے وسائل بھی، اور مجھ پر ایک چھاپ لگی ہوئی ہے جیسے کہ ابھی میرے ایک دوست نے کہا ہے کہ میں ایک مذہبی شخصیت سمجھا جاتا ہوں۔ تو میں ہزار بات انسانیت کی کہوں، واقعات و روزمرہ کی زندگی کی کہوں، لیکن میرے اوپر تو ایک ٹھپہ لگا ہوا ہے کہ میں ایک مذہبی انسان ہوں میں اس سے برأت نہیں کرنا چاہتا ہوں اور نہ دفاع کرنے کو تیار ہوں بلکہ میں اسکو قبول کرتا ہوں لیکن اسمیں ایک Drawback ہے ۔۔۔ یہ ہے کہ میری بات کو جتنا غور سے سننا چاہیے ایک ایسے انسان کی بات جو انسان کے مسئلہ کو لیکر کھڑا ہوا ہے اس میں فرق ہو جاتا ہے، لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ نہ جانے کہاں سے یہ آدمی موڑ دیگا اور تبلیغ کی بات شروع کر دیگا۔ یا معلوم نہیں کہاں سے اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے لگے گا تو بھائی۔ اگر الکشن میں ایک آدمی غلط سے غلط بات کہہ سکتا ہے اور اپنے پارٹی کی حمایت کر سکتا ہے تو میں جس مذہب کو صحیح سمجھتا ہوں اگر اسکی تبلیغ کروں تو کیا بُرا ہے لیکن اس وقت میں تبلیغ نہیں کروں گا، یہ موقع اسکا نہیں ہے اور آپ سب پڑھے لکھے لوگ ہیں میں جو باتیں کہوں گا وہ آپکے لئے جانی بوجھی ہونگی ۔۔۔ تو مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی آواز ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نہیں پہونچا سکتا۔ لیکن آدمی اگر کسی سے نہ کہہ سکے تو کیا اپنے گھر والوں سے بھی نہیں کہہ سکتا ہے اگر وہ اپنے دوستوں سے بھی نہ کہہ سکے تو وہ گھٹ گھٹ کر مر جائیگا۔ اس لئے میں کبھی کبھی اپنی زندگی باقی رکھنے کے لئے ایسے سُننے والے کان اور ایسے دردمند دل چاہتا ہوں جو میری باتوں کو سُنیں اور غور کریں۔

تو میں عرض کر رہا تھا کہ اس وقت جو چیز اس ملک کے لئے سب سے زیادہ خطرناک ہے وہ ہمارا اجتماعی مفاد کو نظر انداز کرنا ہے ۔۔۔ ایک سوسائٹی جب ہی اچھی زندگی گزار سکتی ہے جب اسکے ہر فرد کو کھانے کو ملتا ہو اور سب کی ضروریات زندگی پوری ہوتی ہوں، جب سب ایکدوسرے پر اعتماد رکھتے ہوں، جب سب ایکدوسرے سے گھبراتے نہ ہوں، ایک دوسرے کو دشمن نہ سمجھتے ہوں، سانپ بچھو نہ سمجھتے ہوں، لیکن آجکل ہمارے معاشرے میں یہی چیزیں پیدا ہو گئی ہیں۔ خاص طور پر ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ دور رس نتائج نہیں بلکہ قریبی نتائج سے بے پرواہ ہو گیا ہے۔

طلبا کی بے راہ روی: حالت تو اب یہ ہو گئی ہے ہمارا اسکول کا طالب علم اسکی پرواہ نہیں کرتا کہ اس ٹرین پر بیٹھے ہوئے مسافروں کو کب پہونچنا ہے کوئی اپنی بیمار ماں کو دیکھنے جا رہا ہے کوئی جاں بلب باپ کو دوا دینے کے لئے جا رہا ہے کوئی مہینوں بعد اپنے گھر جا رہا ہے اس کو اپنے گھر کے لوگوں سے ملنے کا کتنا شوق ہے جگہ جگہ زنجیر کھینچنا، اپنے گاؤں یا قصبے کے سامنے گاڑی رکنا معمولات باغ اگر نظر آ جائے تو وہاں اتر کر باغ کا ستیاناس کر دینا، اس باغ کو جو نقصان پہونچا سو پہونچا ہی۔ اور ان مسافروں پر جو گزری وہ گزری ہی لیکن جب کسی ملک کی یہ حالت ہو جائے کہ اجتماعی مفاد سے بالکل آنکھیں بند کر لی جائیں تو میں پیشین گوئی تو نہیں کرتا لیکن یہ ضرور کہونگا کہ یہاں ترقی کی تمام کوششیں بیکار ہے اور یہ یونیورسٹیاں اور لائبریریاں و لیبارٹریز اور سائنس تجربے واکتشافات اور ادب و شاعری کی ساری کاوشیں بیکار و فضول ہیں اگر اس ملک میں یہ مرض اور ترقی کر گیا تو راستے میں چلنا پھرنا مشکل ہو جائیگا، ریلوں پر سفر کرنا دشوار ہو جائیگا دفتروں و کچہریوں سے حاجب براری مشکل ہو جائیگی اسپتال سے دوا لینا اور مریض کو دکھانا مشکل ہو جائیگا۔ شادیوں اور تقریبات میں شرکت کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ اور آخر میں نوبت یہ آئے گی کہ پیاسے کو پانی نہ ملے گا اور بھوکے کو روٹی نہیں ملیگی اس ملک کو سب سے بڑا خطرہ ہے کہ ہر شخص آنکھیں بند کر کے اپنے مطلب کے پیچھے دیوانہ ہو گیا ہے۔ اور چاہتا ہوں کہ رات کو سوؤں اور دن کو لکھ پتی بن جاؤں۔

سیاسی پارٹیوں کے سامنے صرف ایک حقیقت: ہماری سیاسی پارٹیوں کے سامنے صرف ایک حقیقت رہ گئی ہے کہ الیکشن کس طرح جیتا جائے اور اپنی پارٹی کو کس طرح برسر اقتدار لایا جائے، کس طرح حکومت کے وسائل پر قبضہ کیا جائے، اور جیسا کہ میں نے اس سے پہلے ایک جلسہ میں کہا تھا کہ اس سے کوئی بیزاری اور شکایت نہیں کہ کام غلط ہو رہا ہے کہنا یہ ہے کہ یہ غلط کام ہماری نگرانی میں ہو "ارے صاحب کانگریس پارٹی کو بہت دن غلط کاری کرتے ہوئے ہو گئے اور اس ملک کو لوٹتے ہوئے اب ہماری پارٹی کو موقع ملنا چاہیے، اور کانگریس پارٹی کہتی ہے ہم نے ملک کو آزاد کرایا اس لئے اس ملک کو لوٹنے اور اس سے فائدہ حاصل کرنے کا حق ہمارا ہے جب یہ ذہنیت ہو جائے کہ ہمارا مطلب نکل جائے ہمارا الّو سیدھا ہو جائے اور باقی دنیا پر خواہ کچھ گذر جائے خواہ کچھ بھی بیتے۔ یہی ذہنیت آج کام کر رہی ہے۔ ملک کا کیا حال بنا رکھا ہے کیا گت بنا رکھی ہے۔ غلہ یہاں موجود زمین بھی نہایت سرسبز و شاداب اسکے علاوہ ہمارے پاس کتنا بڑا ملک اور کتنی بڑی قوم ہے اور پھر ہر صلاحیت کا آدمی اس ملک میں موجود ہے۔ اور یہ تسلیم کرنے میں مجھے کوئی عار نہیں ہے کہ سیاسیات و ادبیات و سائنس اور صنعت و حرفت میں ہمارے ملک میں فرسٹ گریڈ کے لوگ موجود ہیں لیکن ان سب کے باوجود ہمارے ملک کی یہ حالت ہو رہی ہے کہ کوئی شخص مطمئن نہیں ہے کسی کو کل کے متعلق یقین نہیں ہے کہ کل کیا ہوگا، گرانی کی ایک لہر چلی ہوئی ہے اور ہر شخص ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس ملک کو ایک مرنے والی گائے کے مانند سمجھ رہا ہے کہ اس سے جتنا دودھ دوہا جا سکے دوہ لے۔

یعنی اب ہر ایک یہی تصور کر رہا ہے کہ اس سے جتنا فائدہ اٹھا سکو اٹھا لو یہ خطرناک صورت حال ہے یہ کسی ایسے بھی ملک کو زیب نہیں دیتا جس کی نہ کوئی تاریخ ہو اور نہ کوئی ماضی ہو اور نہ کوئی تمدن ہو اور نہ روایات ہوں، ہمارا ملک تو قدیم تاریخی ملک ہے ایک شاندار و وسیع ادب و تمدن کا مالک ہے اس نے علمی دنیا میں بہت بڑے بڑے فلسفی دانشور پیدا کئے، بڑے رشی اور منی پیدا کئے مسلمانوں میں بھی اور ہمارے ہندو بھائیوں میں بھی ایسے ایسے لوگ پیدا ہوئے جنکے کارناموں پر دنیا ہمیشہ فخر کرتی رہے گی، لیکن جب اس ملک کی یہ حالت ہو جائے کہ سب کے سب اپنے اپنے حال میں مست ہو کر آستین چڑھائے ہوئے اس مردے سے جو کچھ حاصل ہو سکے حاصل کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں تو اسکی کیا حالت ہوگی۔؟ اس ملک کو مردہ کرنے کے ہم ہی مجرم ہیں۔

کشتی ڈوبی تو ہم کہاں جائیں گے: جس شاخ پر ہم نے اپنا نشیمن بنایا ہے جس پر ہمارا آشیانہ ہے آج ہم اسی پر آری چلا رہے ہیں، اسی پر کلہاڑی چلا رہے ہیں اور خوش ہو رہے ہیں ہم اس کشتی کے ڈبونے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں جس پر ہمارا سارا سامان لدا ہوا ہے

تعمیرِ حیات
لکھنؤ
پندرہ روزہ
شعبۂ تعمیر و ترقی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

جلد ۱۶ | ۲۵ر دسمبر ۱۹۷۸ء — ۲۴ر محرم الحرام ۹۹ھ | شمارہ ۴

چندہ سالانہ
اندرون ملک: بارہ روپے
بیرون ملک: بحری ڈاک تمام ممالک ڈھائی پونڈ
ہوائی ڈاک
بیرون ملک: مشرق وسطیٰ سعودی عربیہ ایران وغیرہ پاکستان، برما، لنکا — چار پونڈ
بیرون ملک: ممالک افریقہ — ساڑھے پانچ پونڈ
بیرون ملک: ممالک یورپ — سات پونڈ

اس دائرہ میں اگر سُرخ نشان ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس شمارہ پر آپ کا چندہ ختم ہو چکا ہے لہٰذا اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ یہ دین و ادب کا خادم، ندوۃ العلماء کا ترجمان، آپ کی خدمت میں پہنچتا رہے تو اس کا سالانہ چندہ مبلغ بارہ روپے ارسال فرمائیے، اگر اگلے شمارہ کی روانگی سے پہلے آپ کا چندہ یا خط موصول نہ ہوا تو سمجھ کر کہ آپ کو وی۔ پی کے ذریعے چندہ ادا کرنے میں سہولت ہے۔ اگلا پرچہ مع وی۔ پی خرچ 15/25 Rs کے مطالبہ میں وی۔ پی سے روانہ ہوگا۔ چندہ یا خط بھیجتے وقت اپنا نمبر خریداری لکھنا نہ بھولیں۔

اسحٰق جلیس ندوی

"مر کے جوہر آپ کے جوہر کھلے"

مولانا محمد علی جوہر مرحوم ہماری ملی تاریخ اور تاریخ جدوجہد آزادی کا ایک گم شدہ ورق بن گئے تھے، "صدیوں" کے انعقاد کے سلسلے میں ان کی کسی قدر بازیافت ہو رہی ہے، غالب صدی، گاندھی صدی، اقبال صدی کے بعد محمد علی صدی اس مرد مجاہد اور مخلص انسان کو نئی نسل سے تعارف کا ذریعہ بنے گی۔

مولانا محمد علی جوہر ملک و ملت کا قیمتی سرمایہ اور خدا کا انعام تھے، ان کی پوری زندگی تڑپ، بے چینی، ایثار و قربانی، حصول آزادی کے لئے ہمہ وقت جدوجہد، ہندو مسلم اتحاد کے لئے شب و روز محنت و کوشش میں گذری، بارہا جیل گئے اور یہ کہتے ہوئے کہ۔ ع

مستحق دار کو حکم نظر بندی ملا

مولانا محمد علی جوہر جیسے جامع الصفات مخلص رہنما کسی ملک یا قوم کو صدیوں بعد نصیب ہوتے ہیں، ایک دیندار گھرانے میں پیدا ہوئے، اپنی والدہ بی اماں مرحومہ کی آغوش تربیت میں پروان چڑھے جو اپنی دینداری اور وضعداری میں قرون ماضیہ کی مسلم خواتین کا نمونہ تھیں، اعلیٰ تعلیم لندن میں حاصل کی، مغرب کو قریب سے دیکھا، انگریز کی ترقی کا راز پایا، اس کی چالاکی اور عیاری کا مشاہدہ دیار فرنگ میں رہ کر کیا۔

ہندوستان واپس ہوئے تو مسلمانوں کو جدوجہد آزادی میں شریک کرنے والے نوجوان رہنماؤں میں سر فہرست ان کا شمار ہوا، پرجوش خطیب تھے لیکن جوش خطابت میں قوم کی غلط رہنمائی اور اس میں بے جا جذبات پیدا کرنے کی بجائے ان میں حقیقت پسندی، سنجیدگی اور اعتدال پیدا کرنے کی کوشش کرتے، تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات شروع ہوئیں تو اس ملک میں دو تین برس تک ہندو مسلم اتحاد کی ایسی فضا پیدا ہوئی جس کو دیکھنے والے اسے بھول نہیں سکتے، ہندوؤں نے خلافت کی تحریک میں مسلمانوں کا ساتھ دیا، مسلمان ہزاروں کی تعداد میں کانگریس میں شریک ہوئے اور جنگ آزادی کے سپاہی بنے۔

مولانا محمد علی جوہر دین کا درد رکھنے والے، ملت کا غم کھانے والے رہنما تھے، وہ اردو اور انگریزی کے بہترین انشاء پرداز، خطیب اور اعلیٰ پائے کے پارلیمنٹرین تھے، انگریز ان کی صلاحیت کا لوہا مانتے، برادران وطن ان کے اخلاص اور قربانی جرأت دلیری کے معترف تھے، اگر ہندوستانی مسلمانوں کا کوئی سیاسی قائد "قائد اعظم" کہلانے کا مستحق تھا تو وہ تنہا مولانا محمد علی جوہر تھے، ان جیسی جامعیت کا مخلص قائد پھر اس ملک کو نصیب نہیں ہوا، اللہ تعالیٰ کی مشیت اور مصلحت صرف ۵۲ سال کی عمر میں ۱۹۳۱ء میں مولانا محمد علی حصول آزادی کی راہ میں دیار غیر میں انتقال فرما گئے۔ موت نے انہیں مہلت دی ہوتی تو آئندہ دس بیس سال برصغیر کے مسلمانوں کی زندگی کے ایسے تھے کہ جن میں انہی جیسے مخلص اور حقیقت پسند رہنما کی ضرورت تھی۔ انکے انتقال کے صرف ۱۵ سال بعد برصغیر کے مسلمان نا عاقبت اندیش قیادت میں جس طرح پارہ پارہ ہوئے ہیں، اور جس نئی غلامی کا شکار ہوئے ہیں، شاید اسکی نوبت نہ آتی۔ مولانا محمد علی جوہر کی ان کی زندگی میں قدر نہیں پہچانی گئی، خود مرحوم کو اس کا گلہ تھا، خیال تھا، شاعر تھے کیا خوب کہہ گئے

زندگی میں تو نہ کام آئے مگر — مر کے جوہر آپ کے جوہر کھلے

اسلام اور رواداری

تاریخ کے پروفیسر کہلانے والے ایک مشہور سیاسی لیڈر نے اپنے ایک بیان میں کہا ہے کہ سامی مذاہب، اسلام، عیسائیت یہودیت میں رواداری مطلق نہیں، دوسرے الفاظ میں یہ مذاہب جارحانہ اور دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو ختم کرنا، ان پر ہر قسم کے جبر و ظلم اور نا انصافی کو جائز سمجھتے ہیں۔ عیسائیت اور یہودیت کی صفائی میں کچھ کہنے کا حق ان مذاہب کے ماننے والوں پر ہے جو اس ملک میں متعدد میں آباد ہیں، اسلام پر عدم رواداری کی جو تہمت عائد کی گئی ہے اس سلسلے میں چند جملے تحریر ہیں۔ کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنے کے لئے سب سے پہلے تاریخ انسانی کا تفصیلی مطالعہ موصوف صاحب کریں اور پھر بعثت نبوی اور اسلام کے دین اور اکمل شکل میں دنیا میں آنے اور اس کی تعلیمات کا جائزہ، نیز عالم انسانیت پر اسکے اثرات کا غیر جانبدارانہ تجزیہ کریں تو انہیں اپنے نقطۂ نظر کی خامی کا بخوبی اندازہ ہوگا۔

اسلام نے دنیا میں مختلف خانوں میں بٹے ہوئے انسانوں کو وحدت کا تصور دیا، تمام انسانوں کو آدم کی اولاد قرار دیا، تمام مخلوقات کو اللہ تعالیٰ کا کنبہ کہا۔ وحدت آدم اور وحدت انسان کا تصور نظری طور پر پیش نہیں کیا بلکہ عالم انسانیت کی فلاح کی راہ میں، مظلوموں کی دادرسی اور ظالموں کے قلع قمع کے لئے انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نکالنے، مساوات و برابری کا درجہ دینے اور رنگ و نسل کی تفریق مٹانے کے لئے دعوت و تبلیغ سے لیکر اپنی جان و مال قربان کرنے کا جذبہ اپنے ماننے والوں میں پیدا کیا، جس میں انسانی معاشرہ اپنے کنبہ، خاندان، قبیلہ اور قوم کے مفادات سے آگے سوچ نہیں سکتا تھا، اس دور میں وسعت ذہنی اور رواداری کا وہ تصور اور اسکا عملی نمونہ پیش کیا، جس سے آگے آج کی تمام نہاد متمدن و مہذب دنیا نہیں جا سکی ہے۔ اسلام کی رواداری کی تعلیمات اور تصور وحدت انسان کا یہ اثر تھا کہ ایک نو مسلم خاندان کے فرزند نے پہلی جنگ عظیم کے بعد لیگ آف نیشنز کی تشکیل کے وقت یہ کہا تھا ؎

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام
پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدت آدم
تفریق ملل حکمت افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط وحدت آدم
مکہ نے دیا خاک جنیوا کو یہ پیغام
جمعیت اقوام کہ جمعیت آدم

رواداری دعوے کی چیز نہیں، قومی زندگی میں اس کا نمونہ سامنے آنا چاہیئے، اسلام نے تو محمود و ایاز کو ایک صف میں کھڑا کیا، رواداری کے دعویداروں نے اپنے ہی ایک طبقہ پر تمام خانوں کے دروازے بند کر دیئے، اپنے کنوؤں سے پانی لینے سے روکا، جانور سے بدتر سلوک ان سے روا رکھا گیا، اس ملک کے مسلم...

(بقیہ ص ...)

از: مولانا محمد اویس نگرامی ندوی

تعلیم القرآن

شرم

فَيَسْتَحْيِي مِنكُمْ (احزاب۔ ۷) تو، تم سے وہ شرماتا تھا۔

شرم کی وجہ سے آدمی بہت سی برائیوں سے بچ جاتا ہے! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شرم سے صرف بھلائی پہونچتی ہے، جس شخص کو کسی برے کام کے کرنے میں باک نہیں ہوتا وہ بے حیا اور بے شرم ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم میں شرم و حیا نہیں تو جو چاہو کرو۔

فرمایا کہ ایمان کی کچھ اوپر ساٹھ شاخیں ہیں، اور شرم بھی ایمان کی ایک شاخ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بے حد شرمیلے تھے! حضور کے زمانہ میں ایک شخص نہایت شرمیلا تھا، اس وجہ سے نقصان اٹھاتا تھا۔ اس کا بھائی اس پر ناراض ہو رہا تھا۔ رسول اللہ صلعم نے دیکھا تو فرمایا اس پر غصہ نہ کرو۔ کیونکہ شرم ایمان سے ہے۔

دین کے سمجھنے، حق بات کہنے اور نیکی کے حکم، اور برائی سے روکنے میں شرم میں نہ کرنا چاہیئے۔ قرآن میں ہے کہ اللہ حق بات کہنے میں کسی کا کچھ لحاظ نہیں کرتا۔

ایک صحابیہؓ حضورؐ سے ایک بات پوچھنے آئیں، اور یہ کہہ کر اپنی بات پوچھی کہ یا رسول اللہ صلعم خدا حق بات سے نہیں شرماتا! حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ انصار کی عورتیں کس قدر اچھی تھیں کہ دین کا علم حاصل کرنے سے ان کو شرم روکتی نہیں تھی۔

رحم

رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (فتح۔ ۴) آپس میں رحم دل ہیں۔

آپس کے تعلقات میں ایک دوسرے کے ساتھ نیکی کا جو برتاؤ کیا جاتا ہے، اس کو رحم کہتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو رحم نہیں کرتا ہے اس پر خدا بھی رحم نہ فرمائے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا ہے، اس پر خدا بھی رحم نہ فرمائے گا، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو دوسروں پر رحم نہیں کھاتا ہے، دوسرے بھی اس پر رحم نہیں کھائیں گے۔

فرمایا۔ "رحم کرنے والوں پر، رحم کرنے والا خدا رحم کرے گا، زمین والوں پر تم رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔

ایک بدو نے آپ سے کہا کہ،

"آپ لوگ بچوں کو چومتے ہیں، لیکن ہم لوگ نہیں چومتے، فرمایا کہ خدا نے جب تمہارے دل سے رحم کو نکال لیا تو میرا کیا زور ہے۔"

اپنے چھوٹوں کے ساتھ، خاص طور سے رحم کرنا چاہیئے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے کہا ہے کہ جو شخص ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا ہے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

رحم دل صرف مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ عام انسانوں کے لئے ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

"جو شخص انسانوں پر رحم نہیں کرتا ہے خدا بھی اس پر رحم نہ کرے گا!"

جانوروں پر بھی رحم کرنا اسلام کی تعلیم ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

"اگر کوئی شخص ذبیحہ جانور پر بھی رحم کرے گا، تو خدا قیامت کے دن اس پر رحم کرے گا۔"

محسن انسانیت نے فرمایا

رحمت عالم صلی اللہ علیہ کی شان عفو و کرم

کفار مکہ ۲۱ سال تک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے نام لیواؤں کو ستاتے رہے۔ ظلم و ستم کا کوئی حربہ ایسا نہ تھا جو انہوں نے خدائے واحد کے پرستاروں پر نہ آزمایا ہو حتیٰ کہ وہ گھر بار اور وطن تک چھوڑنے پر مجبور ہو گئے لیکن جب مکہ فتح ہوا تو اسلام کے یہ بدترین دشمن مکمل طور پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے رحم و کرم پر تھے اور آپ کا ایک اشارہ ان سب کو خاک و خون میں ملا سکتا تھا۔ لیکن ہوا کیا؟

ان تمام جباران قریش سے جو خوف اور ندامت سے سر نیچے ڈالے آپ کے سامنے کھڑے تھے۔ آپ نے پوچھا،

"تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہارے ساتھ کیا معاملہ کرنے والا ہوں؟"

انہوں نے دبی زبان سے جواب دیا۔

"اے صادق، اے امین ہم تم ہمارے شریف بھائی اور شریف برادر زادے ہو۔ ہم نے تمہیں ہمیشہ رحم دل پایا ہے۔"

آپؐ نے فرمایا۔ آج میں تم سے وہی کہتا ہوں جو یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا۔

حضورؐ نے فرمایا:-

"تم پر کچھ الزام نہیں۔ جاؤ آج تم سب آزاد ہو۔" صلی اللہ علیہ وسلم

(کتاب الشفا۔ ابن ہشام)

فطرت سلیمہ: آپ تمام احوال و اقوال و افعال میں کبائر سے اور محققین کے نزدیک صغائر سے بھی معصوم تھے۔ اور آپ سے کسی قسم کی وعدہ خلافی یا حق سے اعراض کا صدور ممکن ہی نہ تھا نہ قصداً نہ سہواً، نہ صحت میں نہ مرض میں نہ واقعی مراد لینے میں نہ خوش طبعی میں نہ خوشی میں نہ غضب میں۔

ایفائے عہد: جنگ بدر کے موقع پر مسلمانوں کی تعداد بہت قلیل تھی اور مسلمانوں کو ایک ایک آدمی کی اشد ضرورت تھی۔ حذیفہ بن الیمانؓ اور ابو حسیلؓ دو صحابی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ صلعم! ہم مکہ سے آ رہے ہیں۔ راستے میں کفار نے ہم کو گرفتار کر لیا تھا اور اس شرط پر رہا کیا ہے کہ ہم لڑائی میں آپ کا ساتھ نہ دیں گے۔ لیکن یہ مجبوری کا عہد تھا۔ ہم ضرور کافروں کے خلاف لڑیں گے، حضورؐ نے فرمایا، "ہرگز نہیں تم اپنا وعدہ پورا کرو اور لڑائی کے میدان سے واپس چلے جاؤ۔ ہم (مسلمان) ہر حال میں وعدہ پورا کریں گے۔ ہم کو صرف خدا کی مدد درکار ہے۔"

(صحیح مسلم باب الوفاء بالعہد صفحہ ۸۹ جلد دوم)

حضرت عبد اللہ بن ابی الحماد رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ بعثت سے پہلے میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی چیز خریدی کچھ رقم باقی رہ گئی میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ کیا کہ اسی جگہ لے کر حاضر ہوتا ہوں۔ پھر میں بھول گیا۔ تین دن کے بعد مجھے یاد آیا میں وہاں پہونچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضور صلی اللہ اسی جگہ تشریف فرما ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا، تم نے مجھے مشقت میں ڈال دیا۔ تین دن سے اسی جگہ تمہارا انتظار کر رہا ہوں (ابو داؤد نے اسکو روایت کیا)۔

اس واقعہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تواضع اور ایفائے عہد کی انتہا ہے۔

آپ بیتی

از

مولانا عبد الماجد دریابادیؒ

قیمت

۲۵ روپے

پیش لفظ

از

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

مشہور عالم، مفسر قرآن، صاحب طرز انشاء پرداز اور ادیب مولانا عبد الماجد دریابادیؒ کی "آپ بیتی" مکتبۂ فردوس لکھنؤ نے شائع کی ہے، ۴۰۴ صفحات کی اس دلچسپ اور معلومات افزا کتاب پر مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے پیش لفظ لکھا ہے، کتاب کے تعارف اور افادۂ عام کی غرض سے یہ نذر قارئین ہے۔

مولانا عبد الماجد صاحب دریابادیؒ کی جن کو بقول مولانا شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی مرحوم کے اس دور میں ادب و انشاء کے قلمرو کی حکمرانی نہیں، بلکہ اس عہد کی صاحبقرانی ملی تھی، کسی کتاب پر مقدمہ یا پیش لفظ لکھنے کے خیال سے اُن سے اور ان کے اہل نظر سے شرم آتی تھی جو ان کے مقام و مرتبہ سے واقف تھے، اب ان کی زندگی کے بعد اس کی جرأت کرنے سے ان کی روح سے شرم آتی ہے، لیکن یہ قصور یا گستاخی ایک مرتبہ ان کی زندگی میں بھی ہو چکی ہے اور ان کے علم میں آچکی ہے۔ اور اب ان کی "آپ بیتی" پر چند لفظ لکھنے کی جرأت یا گستاخی پھر ہو رہی ہے، مگر اس کے ذمہ دار برادر مکرم مولوی حکیم عبد القوی صاحب دریابادی "مدیر صدق جدید" ہیں، جنھوں نے یہ مشکل اور نازک کام اس کم سواد کے سپرد کیا، اور اس کے لیے اصرار فرمایا، "مکتبۂ فردوس" کے ذمہ دار جنھوں نے اس کتاب کی طباعت و اشاعت کا بیڑا اٹھایا ہے، بہرحال بڑے تأمل اور معذرت کے ساتھ یہ چند سطریں سپرد قلم کی جا رہی ہیں، عرفی نے اپنے خاص انداز میں ایسے سب "دخل در معقولات" کرنے والوں کے لئے ہمیشہ کے لئے معذرت کر دی ہے ؎

امید ہست کہ بیگانگی عرفی را

بہ دوستی سخنہائے آشنا بخشند

اگر یہ سوال کیا جائے کہ ادب و انشاء، اور تاریخ و تذکرہ کے اصناف میں سب سے زیادہ دلچسپ، دلآویز، خوشگوار، اور شوق انگیز صنف کونسی چیز ہے تو شاید اکثر اہل ذوق کا جواب بھی ہوگا، کہ ایک اچھے صاحب قلم اور ادیب کے قلم سے نکلی ہوئی "آپ بیتی"، یہ انسانی نفسیات کا عجیب معمہ ہے،

کہ انسان کو دوسرے کی کہانی میں بعض اوقات وہ مزا آتا ہے، جو اپنی کہانی میں آتا ہے، خاص طور پر جب وہ کہانی، کہانی کی طرح سنائی جائے، وہ حکمت و فلسفہ اور پند و موعظت کے عناصر، اور ادب و انشاء کے تکلفات سے زیادہ گرانبار نہ ہو، اس میں سادگی اور بے ساختگی، جذبات و احساسات کی ترجمانی، واقعات و مناظر کی سادہ تصویر کشی، غلطیوں اور کوتاہیوں کا کہیں اظہار، کہیں اقرار، اور دے زیادہ آمد اور ہدایت سے زیادہ حکایت ہو، اس کو لکھنے والے نے اپنی یا دوسروں کی بھاری بھرکم تصنیفات میں اضافہ کرنے کے لئے نہ لکھا ہو، بلکہ بھولی ہوئی یادیں تازہ کرنے، مٹے ہوئے نقوش اجاگر کرنے، خود اپنی مسرت، حسرت، عبرت اور اپنے عزیزوں، افراد خاندان، اور نیاز مندوں کو اپنے سے واقف کرنے اور اپنی زندگی کی داستان سنانے کے لیے لکھا ہو، جو محبت و تعلق کا کبھی کھلا ہوا، کبھی پوشیدہ اور خاموش مطالبہ اور فطرت انسانی کا خاصہ ہے اور ایک سلیم الفطرت انسان میں کبھی کبھی یہ جذبہ خود پیدا ہوتا ہے، کہ وہ اپنے عزیزوں اور چھوٹوں کو اپنی زندگی کے واردات، حوادث اور تجربے خود سنائے، اگر یہ جذبہ نہ ہوتا تو دنیا کا ادب مصنوعی اور خارجی بن کر رہ جاتا، اور ہم ادب و شاعری کے حسین ترین حصے سے محروم رہ جاتے، اب یہ اپنا اپنا سلیقہ سنانے والے کی توفیق اور سننے والے کی قسمت ہے کہ یہ داستان اپنی پوری صداقت اور دیانت کے ساتھ بامزا، پرکیف، سبق آموز اور مفید ہو، اور یہیں ایک عامی اور عالم، کم سواد

اور دانشور، اور ادیب و غیر ادیب کا فرق ظاہر ہوتا ہے، لیکن یہ بہرحال ضروری ہے کہ پند و موعظت اور حکمت آموزی کا تناسب اس میں اتنا ہی ہو جتنا کھانے میں نمک کا ہوتا ہے، ورنہ اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا، جو پند ناموں اور فلسفہ کی کتابوں کے ساتھ کیا جاتا رہا ہے، اور اس سے وہ مقصد فوت ہو جائے گا جو "آپ بیتی" لکھنے والے کے عام طور پر پیش نظر ہوتا ہے،

اس "آپ بیتی" میں اگر یہ چند خصوصیات اور جمع ہو جائیں تو پھر "سونے پر سہاگہ" ہو جاتا ہے ایک یہ کہ اس کا لکھنے والا زبان کا ادا شناس، اپنے زمانہ اور اہل زمانہ کا مزاج شناس، کہنہ مشق اور صاحب طرز ادیب بھی ہو، قدرت نے اس کو قوت مشاہدہ کی دولت سے مالا مال کیا ہو، وہ روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے واقعات کو بھی بڑے غور کی نظر سے دیکھتا ہو، اور ان سے بڑے بڑے نتائج نکال لیتا ہو، گرد و پیش کی دنیا سے واقف ہونے کا شوق رکھتا ہو، اس کی اچھی چیزوں کی دل سے قدر کرتا ہو، اور ان کے متعلق بے تکلف اظہار کرنے میں اس کو کوئی شرم مانع نہ ہو، ناگوار اور تکلیف دہ واقعات سے ناگواری محسوس کرتا ہو، اور اس کے اظہار میں بھی وہ کسی تکلف سے کام نہ لیتا ہو، نامور مصنف، عظیم دانشور، مانے ہوئے مفسر، معلم اخلاق، اور ماہر فلسفہ و نفسیات ہونے کے باوجود، وہ معصوم بچپن کی، پھر اٹھتی ہوئی جوانی کی، پھر ڈھلتی ہوئی عمر کی وہ کیفیتیں اور سطح آب پر پیدا ہونے والے ان تموّجات اور اشکال و صُوَر کو جو حباب کی طرح اٹھیں اور حباب کی طرح بیٹھ گئیں، بھولا نہ ہو، اور اب عمر و علم کی اس پختگی اور شہرت و عظمت کے اس مقام پر پہونچکر جس پر وہ برسوں سے فائز ہے، ان کے ذکر کرنے میں وہ کوئی حقارت، یا حیا محسوس نہ کرے، بلکہ موٹے قلم سے ان کی تصویر اس طرح کھینچے کہ پڑھنے والے اس کو پڑھ کر جھوم جائیں، اور ان کو اپنا گذرا ہوا زمانہ، اپنا معصوم بچپن، اور اپنی بیتی جوانی یاد آجائے، اور اس زمانہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے، جو نہ تاریخ میں محفوظ ہے نہ ادب کی کتابوں میں،

مثال کے طور پر اس کتاب میں رسم بسم اللہ کی تصویر کشی دیکھئے جو مسلمان شرفاء اور کھاتے پیتے گھرانوں میں بڑے اہتمام سے منائی جاتی تھی اور جو اسلامی تہذیب کی ایک برکت تھی عہد طفلی کے تذکرہ کے موقعوں پر مولانا کے جادو نگار قلم نے نہ صرف گذرے ہوئے زمانہ کے مناظر کو آنکھوں کے سامنے لاکر کھڑا کر دیا ہے بلکہ ان کے قلم سے وہ جملے بھی نکل گئے ہیں جو سادگی کے باوجود ادب و انشاء کا نمونہ ہیں، مثلاً وہ دایہ کے گود میں جانے کی کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:۔

"ہائے وہ دایہ کے گود میں جانے کی لذت! اب کیا بیان ہو؟ وہ لذت جس کا

بدل نہ جوانی کی گرمیاں دے سکیں نہ بڑھاپے کی خنکیاں"

اپنے بچپن اور اس کے واقعات کو یاد کرتے ہوئے انہوں نے اس جملہ میں کتنا درد بھر دیا ہے،

"غضب کی حسرتناک سچائی بھر دی ہے کسی نے اس مصرعہ میں، ع

دو دن کو لے جوانی، دیدے ادھار بچپن"

زمینداری، پھر اودھ کی زمینداری کا دور گذر گیا، جنھوں نے وہ دور نہیں دیکھا ان کو ہزار بتایا جائے وہ اس کا صحیح تصور ہی نہیں کر سکتے، اس کی کمزوریاں اور خامیاں، اور ان میں دبی ہوئی کچھ خوبیاں، ایک چھوٹی سی نوابی اور ایک خیالی بادشاہی، سخت گیری کے ساتھ رعایا کی کچھ خبر گیری بھی، کچھ ہمدردی بھی، زمینداروں کے لڑکوں کا احساس برتری، اس زمانہ کی مرفہ الحالی اور بے فکری، یہ سب دیکھنا چاہیں تو اس حصہ کو دیکھیں جہاں مولانا نے زمیندار معاشرے کے گھروں کا نقشہ کھینچا ہے، ریل کا سفر کون نہیں کرتا اور اب تو روزمرہ کا معمول ہے، لیکن کتنے آدمیوں کو اپنے ریل کے ابتدائی سفروں کے تأثرات یاد ہوں گے، اور کتنے ان کو بیان کرنے کی قدرت رکھتے ہیں؟ یہی ایک پیدائشی ادیب، اور صاحب فن کا امتیاز ہے کہ وہ مردہ تصویروں میں جان ڈال دے، اور تحریری نقوش کو متحرک بنا دے،

مولانا روزمرہ کے واقعات میں بھی معرفت و تصوف کے نکتے پیدا کرتے ہیں، اور علم الاجتماع، تمدن اور فلسفۂ تاریخ کے بعض ایسے حقائق بیان کر دیتے ہیں جو ہزاروں صفحات کا نچوڑ، اور عمر بھر کے تجربے کا عطر ہوتا ہے، مثلاً ایک موقعہ پر لکھتے ہیں:۔

"سلسلۂ سخن میں ایک بات اور سنتے چلئے، مصنف و مفکر بہترین بھی ہو اپنے زمانہ کا بندہ ہوتا ہے، کیسے ممکن ہے کہ کوئی کتاب بشری دل و دماغ سے، دو چار سو سال قبل سے نکلی ہوئی آج کے مسلّمات کا ساتھ دے سکے:"

مولانا نے اپنے اسکول کے داخلہ کے تأثرات، ایک ادیب اور ماہر نفسیات کی طرح جس کو قوت مشاہدہ بھی بھرپور طریقہ پر ملی ہے، اور بچپن کی ہر چیز بھی اس کو جان کی طرح عزیز ہے بڑی تفصیل اور دلچسپی کے ساتھ قلم بند کئے ہیں، وہ سیتاپور کے بیتے ہوئے دن بھی نہیں بھولتے، لیکن اس کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ لکھنؤ کا ترقی یافتہ اور بوقلمون ماحول اپنا اثر کئے بغیر نہ رہا، وہ لکھتے ہیں:۔

"نئی نئی دلچسپیاں لکھنؤ میں پیدا ہوتی گئیں اور سیتاپور کی دلچسپیاں ان کے آگے سرد، بلکہ گرد ہوتی گئیں۔"

پھر وہ عمر کی منزلوں، لڑکپن، جوانی اور بوڑھاپے کے قدرتی نظام پر تبصرہ کرتے ہوئے، اپنے خاص ادبی انداز میں لکھتے ہیں:۔

"فاطر کائنات نے اپنی پیدا کی ہوئی دنیا کا نظام کچھ ایسا رکھ دیا ہے، لڑکپن کو جوانی اور جوانی کو ضعیفی کس تیزی کے ساتھ دھکیلتی، ریلتی، پیلتی چلی جاتی ہے۔"

اس کتاب کے بعض جملے سادگی اور پرکاری کا نمونہ ہیں، واقعہ نگاری بھی اور انشاء پردازی بھی۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"شوق کے پیروں سے دوڑ کر نہیں، شوق کے پروں سے اڑ کر اس کے یہاں پہنچا۔"

ازدواجی زندگی کا باب بھی انسانی زندگی کا ایک اہم فطری اور شرعی باب ہے، جس کے بغیر کوئی "آپ بیتی" مکمل نہیں اس کے بیان کرنے میں بھی مولانا کی حیثیت ایک ادیب، ماہر نفسیات و معلم اخلاق، ایک حساس و محبت آشنا انسان اور ایک عالم دین کی حیثیت سے نمایاں ہے،

غرض یہ کتاب جو مولانا نے اپنی زندگی کے آخری دور میں لکھی اور اس پر بار بار نظر ثانی فرمائی، ادبی، اخلاقی اور تاریخی تینوں لحاظ سے قدر و قیمت کی حامل ہے، مولانا نے اس میں اپنے دور الحاد کا قصہ بھی پوری صفائی اور اخلاقی جرأت کے ساتھ سنایا ہے، اس کے اسباب و عوامل بھی بیان کئے ہیں جس سے ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں،

پھر دین فطرت کی طرف بازگشت اور اس کے اسباب و دواعی کا بھی ذکر کیا ہے، اپنے خاندانی بزرگوں کے ساتھ، اپنے مربیوں، محسنوں، دوستوں، اور مخالفین، ناقدین سب کا ذکر فراخ دلی اور صاف گوئی کے ساتھ کیا ہے اور کسی کی رو رعایت نہیں کی، ان کا بھی ذکر کیا ہے جن سے ان کو تکلیف پہونچی، ان کا بھی ذکر کیا ہے جن کے حق میں ان سے زیادتی ہوئی، غرض یہ کتاب انکی زندگی کا مرقع ہے ہی، اس دور اور معاشرت کا بھی آئینہ ہے جس میں انہوں نے آنکھیں کھولیں اور زندگی کا سفر طے کیا، کسی زمانہ میں بلکہ قریبی زمانہ میں اُن اہل قلم اور مورخوں کو بھی اس سے بڑی مدد ملے گی جو اس دور کے تمدن و معاشرت پر کچھ لکھنا چاہیں گے، اس کتاب میں اُن کو بعض ایسے اشارے ملیں گے جن سے وہ بہت کام لے سکتے ہیں، اور اس زمانہ کی بولتی ہوئی تصویر پیش کر سکتے ہیں، ادب کے طالب علموں، بلکہ ادب کے استادوں اور معلموں کو بھی اس میں ادب و زبان کی خوبیاں، لکھنؤ اور اودھ کے محاورے، اساتذہ کے آبدار اشعار اور جاندار مصرعے، اردو ادب و زبان کے گذشتہ دور، اور لکھنؤ کے ادیبوں اور شاعروں سے تعارف ہوگا، دین و اخلاق اور اصلاح و تربیت نفس کے سلسلہ میں بھی اس سے رہنمائی حاصل ہوگی، اور اس طرح ظاہری و معنوی دونوں طرح سے یہ کتاب ہر طبقہ کے لئے دلچسپ، دلکش اور دلآویز ہوگی ؎

بہ رنگ ارباب صورت را

بہ بو ارباب معنیٰ را

ابو الحسن علی ندوی
دائرہ شاہ علم اللہؒ

بقیہ صفحہ ۳، اداریہ: باشندوں اور اوڑوں پر جو ظلم و ستم توڑا گیا اور انہیں جس طرح جنوب میں پناہ لینے پر مجبور کیا گیا وہ تاریخ کا زندہ باب ہے۔

اسلام کی رواداری تعلیمات کا اثر تھا کہ ہندوستان میں ۸۰۰ سال تک اسکے نام لیوا حکمراں رہے اور ان آٹھ صدیوں میں غیر مسلم اکثریت پر منظم حملے کے دس واقعات بھی نہیں ہوئے، جبکہ رواداری کے دعویداروں نے حکمراں ہونیکے بعد ۳۰ سال کی مدت میں ہزاروں مرتبہ یہاں کی اقلیتوں کے خون کی ہولی کھیلی، انکی آبادیوں کو اجاڑا، انکے کھیتوں کو ویران کیا، اسلام اور مسلمانوں کی رواداری کی مثال آج بھی بے شمار مسلم ممالک ہیں، جہاں ہزاروں کی تعداد میں غیر مسلم بھائی رہتے ہیں، جو تجارت، ملازمت اور مختلف کاموں میں امن و عافیت سے باعزت زندگی گذار رہے ہیں، مدھوک صاحب ذرا اعداد و شمار تو اکٹھے کریں کہ کتنے ہزار ہندوستانی غیر مسلم لیبیا، متحدہ عرب امارات، کویت، سعودی عربیہ، نائیجیریا، الجیریا، افغانستان، عراق، ایران، مراکش، سوڈان، انڈونیشیا، ملیشیا میں ہیں، کیا کبھی ان پر مذہبی بنیاد پر کوئی زیادتی کبھی ہوئی ہے؟ جبکہ ان ممالک کے مسلم عوام خوب جانتے ہیں کہ ہندوستان میں مسلم اقلیت کے خلاف فسادات یہاں کا روزمرہ کا معمول ہے، تاہم ان کی فراخدلی اور اسلام کی رواداری کا یہ فیض ہے کہ وہ اس کا انتقام وہاں آباد غیر مسلموں سے نہیں لیتے۔ آج بھی اس ملک کے لاکھوں غیر مسلم یہ تمنا کرتے ہیں کہ وہ کسی مسلم ملک میں جاکر روزگار پائیں ــــ اسرائیل اور عربوں میں نصف صدی سے کشمکش ہے، یہودیوں کے ظلم و ستم کے شکار فلسطینی عوام اور انکے ہمدرد کبھی بھی اپنے ملک میں آباد یہودیوں سے انتقام نہیں لیتے، آپ کبھی یہ نہیں سنیں گے کہ کسی مسلم ملک میں آباد یہودی اقلیتوں پر وہاں کی مسلم اکثریت نے حملہ کیا ہو ــــ رواداری برتنے کی چیز ہوتی ہے، دعوے کی نہیں، اور پھر ایسا دعویٰ جسکی تردید تاریخ کا ہر ورق خود کر رہا ہو اس سے زیادہ دھاندلی اور کیا ہوگی۔

بقیہ صفحہ ۱۱، ندوۃ العلماء، منزل بمنزل: موقع کو پسند کرنا ضرور ہے، لکھنؤ کا نام بیشک دلی کیساتھ ہی تجویز کیا گیا ہے اور میرے خیال میں لکھنؤ میں ایسے اسباب مہیا ہیں جن سے ہم جلد کام لے سکتے ہیں اور میری ناقص رائے میں اگر اس جلسے نے یہ تجویز مقام منظور کر لیا تو ہم اسی جلسے میں اپنے آپ کو دار العلوم کی عملی کارروائی کے میدان میں پائیں گے، لہٰذا میں یہ گذارش کرتا ہوں کہ بجائے دہلی کے لکھنؤ قیام دار العلوم کے لئے منظور فرمایا جائے۔

(جاری)

کل ہند موتمر علوم اسلامیہ کا اجلاس ششم منعقدہ دارالعلوم ندوۃ العلماء

ایک مختصر روداد

(ڈاکٹر محمد اقبال انصاری، معتمد عام موتمر)

کل ہند موتمر علوم اسلامیہ کا اجلاس ہفتم دارالعلوم تاج المساجد بھوپال کے زیر اہتمام ۹ تا ۱۱ر ستمبر ۱۹۷۴ء منعقد ہوا تھا اور اسی میں طے پایا تھا کہ اگلا اجلاس دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے زیر اہتمام منعقد ہوگا۔ اسے ۱۹۷۶ء میں منعقد ہونا چاہیئے تھا مگر چند ناگزیر اسباب کی بناء پر نہ صرف اس سال بلکہ سال گزشتہ (۱۹۷۷ء) کو بھی منعقد نہ ہو سکا اور اس سال ۶ تا ۸ر اکتوبر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی زیر صدارت منعقد ہوا۔

اجلاس کا افتتاح جمعہ ۶ر ۱۹۷۸ء کو دس بجے صبح دارالعلوم کے وسیع عباسیہ ہال میں ہوا جس کا آغاز تلاوت قرآن پاک سے ہوا، اس کے بعد مولانا قاری محمد طیب صاحب، مہتمم دارالعلوم دیوبند، نے افتتاحی خطاب فرمایا جس میں اس بات پر خاص زور دیا کہ اسلامی تحقیقات کا اصل نصب العین عقائد کی پختگی واستواری ہونا چاہیئے اور اسے اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کے لئے راہ ہموار کرنا چاہیئے۔ آپ نے ادارہ علوم اسلامیہ، علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کی اس خدمت کو سراہا جو وہ مختلف جامعات اور مدارس کے زیر اہتمام موتمر کے اجلاس منعقد کرکے انجام دے رہا ہے۔ آپ نے اس ادارہ کی علوم اسلامیہ پر تحقیقی خدمات کو سراہتے ہوئے دعا فرمائی کہ یہ کام عروج کمال تک پہونچے۔

افتتاحی خطاب کے اختتام پر مولانا عبدالسلام قدوائی، معتمد تعلیمات دارالعلوم ندوۃ العلماء وصدر مجلس استقبالیہ، نے موتمر کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنی ودیگر ارکان مجلس استقبالیہ کی جانب مہمان خصوصی، مولانا قاری محمد طیب صاحب، مندوبین موتمر اور تمام شرکاء اجلاس کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔

اس کے بعد مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (صدر اجلاس ہشتم) نے اپنا پرمغز وفاضلانہ خطبۂ صدارت پیش فرمایا جس میں انہوں نے اسلامی علوم وفنون میں ہندوستانی علماء وفضلاء کی علمی وتحقیقی کاوشوں کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی گرانقدر خدمات کو سراہا اور اس پر زور دیا کہ حالات حاضرہ کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے انگریزی میں معیاری اسلامی لٹریچر تیار کرکے مستشرقین کی دریوزہ گری سے جس قدر جلد ممکن ہو سکے چھٹکارا حاصل کیا جائے اور ان کی خوشہ چینی کی بجائے اسلامی تحقیقات کو نئے انداز سے پیش کرکے خود انھیں حلقہ بگوش اسلام بنانے کی وسیع پیمانہ پر جدوجہد کی جائے اور "اس طرح تعلیم یافتہ مسلمان نوجوان نہ صرف اس ذہنی وتہذیبی ارتداد کے خطرہ سے محفوظ ومامون ہو جائیں گے جو بہت تیزی کے ساتھ ان ملکوں میں پھیل رہا ہے جو مغرب کے زیر اقتدار رہیں بلکہ وہ مغرب میں اسلام کی تبلیغ، قرآن مجید اور سیرت نبوی سے تعارف انھیں اسلام کے چشمۂ حیات پر لانے کا ذریعہ بھی بن سکیں گے"۔ آخر میں آپ نے دعا فرمائی کہ یہ موتمر ہر طرح اپنے مقاصد میں کامیاب اور نئے عزائم ومساعی کا مقدمہ ثابت ہو۔

ہندوستان میں ایرانی سفارتخانہ کے ثقافتی اتاشی، رضا حلوی صاحب نے اس کے بعد فارسی میں تقریر کرتے ہوئے ایران میں اسلام کی اشاعت، اسلامی تحقیقات وتصنیفات کی ترویج اور اسلامی علوم وفنون کی ترقی کا سرسری جائزہ لیا اور امام غزالی، شیخ طوسی اور دیگر علماء وفضلاء کی خدمات کو سراہتے ہوئے کہا کہ پہلے ایران میں اسلام کا مقابلہ عیسائیت سے تھا مگر اب مارکسزم (MARXISM) سے ہے اور اس سے نبرد آزما ہونے کے لئے بھی دفاعی طریقہ ہی اختیار کیا جا رہا ہے۔

اس کے بعد راقم الحروف نے موتمر کے ۱۹۷۴ء میں قیام کے بعد سے اب تک سرگرمیوں کا مختصراً جائزہ لیا اور آئندہ کے لئے لائحہ عمل پیش کیا۔ اس افتتاحی اجلاس کے اختتام پر معتمد مقامی، مولانا محمد رابع ندوی، استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء نے ہندستان کے گوشہ گوشہ سے آئے ہوئے علماء وفضلاء کو خوش آمدید کہا اور اپنی اور طلباء واساتذہ دارالعلوم اور کارکنان موتمر کی جانب سے تمام حاضرین جلسہ بالخصوص مندوبین کا شکریہ ادا کیا۔

اسی روز بعد نماز مغرب مقالات خوانی کا پہلا اجلاس منعقد ہوا جو نماز عشا تک جاری رہا۔

دوسرے روز تین اجلاس ہوئے، پہلا صبح سوا نو بجے سے سوا بجے تک، دوسرا سہ پہر سوا تین بجے سے سوا چار بجے تک اور تیسرا شام سوا چھ بجے سے رات ساڑھے آٹھ بجے تک۔ مقالات خوانی کا آخری اجلاس ۸ر اکتوبر کو صبح نو بجے سے دوپہر ڈیڑھ بجے تک ہوا، ان اجلاسوں میں اسلامیات کے مختلف موضوعات پر اکتالیس مقالات پیش کئے گئے۔ دو عربی (جن میں ایک مولانا سعید الاعظمی ندوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء ومدیر البعث الاسلامی کا اور دوسرا ڈاکٹر محمد راشد ندوی استاد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا تھا) چودہ انگریزی اور پچیس اردو میں، جن پر مختصر مگر مفید و پرمغز مباحثہ بھی ہوا۔ اجلاس سابق میں مندوبین کی کل تعداد ۷۹ تھی جن میں سے پچپن نے شرکت فرمائی تھی مگر صرف ۲۷ نے مقالے پڑھے تھے اس اجلاس میں مندوبین کی کل تعداد ۸۶ تھی۔ جن میں سے ۶۴ نے شرکت فرمائی، اور ۴۱ مندوبین نے بتفصیل بالا مقالے پیش فرمائے۔ اجلاس سابق میں عربی مدارس کے اساتذہ وفضلاء نے صرف دو مقالے پیش کئے تھے مگر اس بار اُن کی تعداد ماشاء اللہ چھ تھی (ان میں سے بیشتر مقالے دارالعلوم ندوۃ العلماء سے متعلق افراد کے تھے، یہ مقالہ خواں تھے مولانا محمد رابع صاحب ندوی، مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی، مولوی سید سلمان حسنی ندوی، مولوی شمس تبریز صاحب، جناب سید غلام محی الدین صاحب) اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دو دہائی کی قلیل مدت میں موتمر جامعات وعربی مدارس کے اساتذہ اور علماء وفضلاء کو قریب لانے میں کس حد تک کامیابی حاصل کر چکی ہے۔

مقالات کے بعد پروفیسر سید مقبول احمد، نائب صدر موتمر نے حالیہ اجلاس اور اس کے مقالات کا سرسری جائزہ لیا اور مقالہ نگاروں کو ان کی علمی وتحقیقی کاوشوں پر خراج عقیدت پیش کیا اور موتمر کی غرض وغایت اور افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ "اسلامی تاریخ اور اس کی عظمت رفتہ سے آج کل کے مسلمانوں اور بالخصوص عوام کو باخبر کرنے کی شدید ضرورت ہے اور ہمیں نہ صرف دینی طور پر بلکہ علمی وتحقیقی طور پر مسلمانوں کے 'علم کے موتیوں' اور ان کی گرانقدر وبیش بہا خدمات کو اجاگر کرنا ہے اس لئے کہ ان کی ان خدمات کا علم عوام تو درکنار خواص کو بھی کما حقہ نہیں ہے۔ اس لئے اس موتمر کو چاہیئے کہ وہ مسلمانوں کی تاریخ ماضی کے روشن وتابناک ابواب اور زریں اوراق نہ صرف مسلمانوں بلکہ ساری علمی دنیا کے سامنے پیش کرے اور مسلمانوں کے انحطاط وتنزل کے اسباب کا عمیق مطالعہ کرکے انھیں آئندہ پیش آنے والے خطرات سے بھی باخبر کرے۔"

موتمر کے صدر، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنی اختتامی تقریر میں اس قسم کے موتمروں کی اہمیت وافادیت اور انھیں جاری رکھنے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے بلند نگہی، علو ہمتی کے ساتھ علم وتحقیق کے سفر کو جاری رکھنے اور ایسے شہباز وشاہین بننے کی نصیحت کی جو کسی ایک شاخ پر قناعت نہیں کرتا بلکہ ہمیشہ شاخ بلند تر کی تلاش وجستجو میں رہتا ہے اس لیے تحقیق میں بھی ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش جاری رکھنا چاہیئے۔ انہوں نے زور دے کر فرمایا کہ علم بڑے ہی احتیاط کی چیز ہے مگر درس وتحقیق سے بھی زیادہ احتیاط کی چیز ہے۔ مولانا نے امام غزالی کے ذوق تجسس اور شوق تفحص کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ علم ایک مستقل سفر ہے جس کی کوئی منزل نہیں ہے اور اگر اس کی منزل متعین ہو جائے تو پھر رہ ہی

(بقیہ صدہ پر)

قسط ۲

دس دن — پانچ دریاؤں کی سرزمین میں

(اسحٰق جلیس ندوی)

جن تاریخوں میں پنجاب اور ہریانہ کا سفر طے کیا گیا تھا انہی ایام میں ہولی کا تہوار بھی پڑ رہا تھا، اتر پردیش بہار اور مدھیہ پردیش میں اس تہوار کو جس انداز میں منایا جاتا ہے، ہولی کے دنوں میں اس علاقہ سے گذرنے والی ٹرینوں کا حلیہ، کیچڑ اور خشت باری سے بگڑ جاتا ہے، مسافر کھڑکیوں کے پٹ بند کرکے اپنی آنکھ، سر اور جان کی خیر مناتے ہیں، خاص ہولی کا دن تو الامان۔ تہوار اور عید کو خوشیاں لوٹنے اور بکھیرنے کے لئے انسانوں نے دور قدیم سے اب تک اپنایا تھا، آج انسانی معاشرہ سے اخلاقی قدروں کے زوال کے بعد یہی تہوار نسل انسانی کے لئے مسئلہ بن گئے ہیں، جب سوسائٹی میں بگاڑ آتا ہے، دوسروں کے درد وغم، احساسات وجذبات، صحیح اور غلط کا شعور ختم ہو جاتا ہے تو اچھی چیزیں بھی برائی کا آلہ اور بروں کی آلۂ کار بن جاتی ہیں۔

یہ سفر تشویش کے ساتھ شروع ہوا، لیکن جب ہم نے پنجاب کی سرزمین میں قدم رکھا تو یہ محسوس بھی نہیں ہوا کہ ہولی نام کے کسی تہوار کا اپنی روایات اور خصوصیات کے ساتھ یہاں وجود ہو، البتہ انہی دنوں پنجاب کی سکھ آبادی "ہولا" نامی اپنا تہوار منا رہی تھی اسکھ مرد، عورتیں اور بچوں کی بڑی تعداد اپنے مقدس گردواروں کی طرف رواں دواں تھی، راستے میں کبھی کبھار "ست سری اکال" کا نعرہ لگاتے ہوئے اُن سکھ یاتریوں کی ایک خصوصیت یہ دیکھی کہ یہ لوگ اپنے گردوارے میں (جو درگاہ حضرت مجدد صاحبؒ سے چند گز کے فاصلے پر ہے) جانے سے پہلے حضرت مجدد صاحبؒ کے روضہ کے سامنے سواریاں کھڑی کرتے ہیں اور عقیدت سے اندر جاکر درشن کرتے ہیں۔

مالیر کوٹلہ جانے کے لئے ایک ہی کار کا نظم ہو سکا تھا، جانے والوں کی تعداد زیادہ تھی، لہٰذا چند احباب نے بس سے سفر کرنے کا فیصلہ کیا اور یہ فیصلہ اس علاقہ کو، یہاں کے عوام کو قریب سے سمجھنے میں بہت مفید ثابت ہوا، سکھوں کے تہوار کی وجہ سے بسوں میں بہت بھیڑ تھی، کچھ دیر انتظار کے بعد ایک بس ڈرائیور نے ہم اجنبیوں کی رعایت میں بس کھڑی کر دی، بس میں سوار ہوئے تو ہر متنفس کی نگاہ اور توجہ کا مرکز ہم لوگ تھے، مگر ان نگاہوں میں نفرت اور حقارت کی بجائے اپنائیت اور خلوص، محبت اور رواداری کے کنول کھلے ہوئے محسوس ہوئے، ایک سردار صاحب نے اپنی نشست سے اٹھ کر راقم سطور کو بیٹھنے کی پیشکش کی، اس جذبہ کا شکریہ ادا کرکے معذرت کی کہ آپ کیوں زحمت فرماتے ہیں تو جواب دیا "اگلے اسٹاپ پر مجھے اترنا ہے ویسے بھی آپ ہمارے مہمان ہیں، آپ حضرات کہاں سے تشریف لائے ہیں۔؟" تعارف ہوا، اپنے مقصد اور مشن سے آگاہ کیا تو بڑے متاثر ہوئے اور گرہیں کھلیں، بند ٹوٹا اور ماضی کا وہ سیلاب رواں ہوا جس میں محبت تھی، مذہبی بنیادوں پر نفرت وحقارت کی سیاست کا وجود نہیں تھا، ۱۹۴۷ء سے قبل کے اپنے وطن سیالکوٹ کے پرکیف اور پرعافیت روز وشب کا وہ تذکرہ کرتے رہے، اپنے ان شریف مسلمان بھائیوں کو یاد کرکے آبدیدہ ہوئے جنہوں نے انہیں اور ان کی طرح کے کئی غیر مسلموں کو اپنی جان پر کھیل کر بچایا تھا، تحریک پیام انسانیت کا اردو لٹریچر انہوں نے طلب کیا، اردو سے اپنے شغف اور دلچسپی کا تذکرہ کیا، اور ایسے خلوص اور محبت سے رخصت ہوئے جیسے برسوں کی شناسائی اور دوستی ہو۔ بس میں ہماری گفتگو پر قریب اور دور کے اکثر مسافر گوش بر آواز تھے، اب سلسلۂ تعارف وسیع ہوتا گیا، راستے میں جب مغرب کی نماز کا وقت آیا تو ہماری خواہش پر بس کے مسافروں نے ڈرائیور کو بس روکنے کی ہدایت کی، پنجاب کے ایسے علاقہ سے ہم گذر رہے تھے جہاں اللہ تعالیٰ کی کبریائی کے کلمات سے، اللہ اکبر اور حی علی الفلاح کی صدا سے ۱۹۴۷ء سے پوری فضا نامانوس ہو چکی تھی، اذان دی گئی، نماز شروع ہوئی بس کے مسافر اور اطراف کے لوگ ایک بھیڑ کی شکل میں ہمارے ارد گرد جمع ہو گئے، فرض پڑھ کر دعا کی اللہ تعالیٰ کے اس انعام اور احسان پر قلب میں گداز پیدا ہوا کہ اس نے ہمیں اس سرزمین میں اپنے نام کی کبریائی کا اعلان کرنے اور اپنے حضور سجدے کی توفیق عطا فرمائی، مجمع پر ہم عاصیوں کا نہیں البتہ نماز کی عظمت کا نقش صاف محسوس ہو رہا تھا۔

ایک اسٹاپ پر ساتھیوں نے ایک غیر مسلم ہوٹل والے سے اپنے مشن کا تعارف کرایا تو وہ ایسا متاثر ہوا کہ اس کا اصرار تھا کہ آپ میری چائے قبول کریں، راقم سطور سے ملنے وہ اپنی ہوٹل چھوڑ کر بس میں آیا، اور برابر یہ اصرار کرتا رہا کہ میری چائے قبول کریں اور میں شام کو مالیر کوٹلہ آپ کے جلسے میں آؤں گا، ایک غیر مسلم نوجوان کا یہ تاثر اور ایک ایسے علاقہ میں جہاں فرزندان توحید کا نام ونشان مٹانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی گئی تھی، ہمارے لیے بڑا حوصلہ افزا انکشاف تھا، انسان وقتی حالات پر قطعی فیصلہ نہیں کر سکتا، تاریخ کے اوراق اور فطرت کا نظام الٹ پھیر، دن اور رات اور عروج وزوال کی نہ ختم ہونے والی داستان ہے، مایوس انسان سے بڑھ کر دنیا میں کوئی کور چشم اور بے بصیرت نہیں۔

مالیر کوٹلہ ایسے وقت پہونچ کر عشاء کی نماز کی تیاری ہو رہی تھی، حضرت مولانا بذریعہ کار ہم سے تھوڑی دیر پہلے پہونچ چکے تھے، ہم سب کا قیام صوفی اسماعیل صاحب کے مکان پر تھا، عشاء بعد مالیر کوٹلہ کی جامع مسجد میں جلسے کا انتظام تھا، جلسے میں افتتاحی کلمات راقم سطور نے کہے، اس کے بعد ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین صاحب قریشی نے بڑے موثر انداز میں ملک کی موجودہ صورت حال کو بیان کرتے ہوئے تحریک پیام انسانیت کی اہمیت پر روشنی ڈالی، اس کے بعد حضرت مولانا نے خطاب فرمایا، مولانا نے فرمایا:-

اتنی بات تو سب جانتے ہیں، ایک قافلہ بے سروسامانی کے عالم میں مکہ سے مدینہ پہونچا تھا، اپنی جان ومال، عزت وآبرو اور اپنا مستقبل سب کچھ داؤ پر لگا کر اس قافلہ کے افراد مدینہ پہونچے تھے، اس وقت دنیا کو دو طاقتوں نے باہم تقسیم کر دیا تھا، ایک بازنطینی شہنشاہیت تھی جو دنیا کے شمال مشرق کی اجارہ دار تھی، دوسری ایرانی شہنشاہیت تھی نیشاپور سے لے کر دریائے سندھ کی وادی تک اس کا سکہ چل رہا تھا اور ڈنکا بج رہا تھا، یہ دونوں شہنشاہیتیں پوری دنیا کی مالک بن گئی تھیں اور پوری انسانی آبادی ان کی غلام بنی ہوئی تھی، ان کے رحم وکرم پر جی رہی تھی، مدینہ کی اس مختصر جماعت کی اس دور کے سیاسی پیمانے اور اقوام وملل کے میزان میں کوئی حیثیت نہیں تھی، کوئی وزن نہیں تھا، خاص طور پر عربوں کا یہ حال تھا کہ انہیں یہ اہمیت ہی نہیں دی جاتی تھی کہ ان پر کوئی توانائی خرچ کی جائے، اس پر قبضہ کرنے کا خیال تک کیا جائے، دنیا کی بھوک میں زمین کی بھوک جوع الارض کی بڑی اہمیت ہے، کھانے کی بھوک اندرونی خواہشات کی بھوک غرض تمام بھوک کے مقابلے میں زمین کی بھوک ایسی بھوک ہوتی ہے جس کی کبھی تسکین نہیں ہوتی، لیکن عرب اتنے حقیر اور بے وزن تھے، ان کی زمین ایسی بنجر اور ان کے صحرا ایسے بے فیض سمجھے جاتے تھے کہ جن میں کوئی کام کی چیز نہ ہو، اس لئے جو بادشاہ ایک ایک چپہ زمین کے لیے جان دیتے تھے وہ عرب کی زمین کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے، وہ عربوں کو نگاہ حقارت اور جذبۂ رحم سے دیکھتے کہ کیا ان کی زندگی ہے، دنیا کے سیاسی نقشے میں عربوں کی یہ حالت تھی۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں جو نقشہ کھینچتا ہے، اس سے بڑھ کر اس دور کی صحیح عکاسی اور کیا ہوگی،

واذکروا نعمۃ اللہ اذ کنتم مستضعفین فی الارض یخافون ان یتخطفکم الناس۔ وہ دن یاد کرو جب تم اقلیت میں تھے اور زمین پر کمزور ترین اور اس خوف میں مبتلا کہ لوگ تمہیں چیل کی طرح جھپٹ کر نہ لے جائیں۔

جب مسلمانوں نے روم وایران کو فتح کیا تھا اس وقت مسلمانوں کا یہ حال تھا کہ جیسے بارش میں بھیگی ہوئی بھیڑیں۔

میں دراصل آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کا مقام کیا ہے؟

نقشہ تو یہ تھا کہ مدینہ میں مٹھی بھر مسلمان اپنے جان و مال اور مستقبل کے خطرہ میں مبتلا شب و روز گذار رہے تھے۔ لیکن ان سے کیا کہا جا رہا تھا؟ ان کو کیا مقام دیا جا رہا تھا؟ ان پر کتنے اہم کام کا بوجھ رکھا جا رہا تھا؟ ان سے کہا یہ گیا کہ تم مل جل کر رہو، تم نے اخوت کا رشتہ مضبوط کیا، بالقصد اہل دعوت کا کردار ادا کیا تو کیا ہوگا؟

اس حالت کا تصور کیجیے جو مدینہ کے مسلمانوں کا تھا، مالیر کوٹلہ کے مسلمان بے شک ۱۹۴۷ء میں سخت آزمائش کا شکار ہوئے ہوں گے، لیکن اب الحمد للہ وہ صورت حال نہیں لیکن مدینہ کے مسلمان اس سے کہیں زیادہ سخت امتحان میں مبتلا تھے، بچہ بچہ ان کا دشمن تھا، پورے جزیرۃ العرب میں انکا کوئی ہمدرد نہیں تھا، ان کی بے کسی، بے سر و سامانی، اقلیت کے باوجود ان سے کیا خطاب کیا جا رہا ہے، اے بے سر و سامان مسلمانو! ایک گنتی کے چند مسلمانو! اے وہ مسلمانو! جن کو اپنے مستقبل کا پتہ نہیں۔

الا تفعلوہ تکن فی الارض فتنۃ و فساد کبیر۔

ان کمزور اور قلیل مسلمانوں سے کہا گیا کہ اگر تم نے دین کی دعوت، خیر کی دعوت، انسانیت کی خدمت اور اصلاح عالم کا فریضہ انجام نہ دیا تو یہ زمین فتنوں اور فسادات کی، ناانصافی اور ظلم و ستم کی آماجگاہ بن جائے گی۔

غور کیجیے کہ ایک ایسی جماعت کے سپرد جو اپنی تعداد اور اسباب و وسائل کی کمی اور بے سر و سامانی میں پوری دنیا میں بے مثال تھی، اس پر پوری دنیا کی اصلاح اور عالم انسانیت کے امن و عافیت کا بوجھ ڈالا گیا۔ اس مقدس جماعت سے اللہ تعالیٰ نے یہ کام لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ۔۔۔

ہری ہو گئی ساری کھیتی خدا کی

دور اول کے اس واقعہ میں ہم ہندوستانی مسلمانوں کے لئے بڑا سبق ہے، یہ واقعہ ہمیں حوصلہ دینے اور کمر ہمت باندھ لینے کے لیے کافی ہے۔ ہم اس ملک میں اپنی قلیل تعداد، بے سر و سامانی اور جان و مال عزت و آبرو کے خطرات کے باوجود انسانیت کے سدھار اور معاشرہ کی اصلاح کا عمل کر سکتے ہیں، ہم اگر اعلیٰ اخلاق و صفات، اصول پسندی اور سچائی، دیانت و امانت کے علمبردار گروہ کی حیثیت سے اس ملک کے تمام طبقوں تک، بلا تفریق مذہب و ملت تمام افراد تک اخلاق، انسانیت، انصاف، امن و عافیت اور روحانیت کا پیام پہونچاتے ہیں تو ہم اس کمی کو پورا کر سکتے ہیں جو اس ملک میں باوجود ہر قسم کی مادی اور عددی ترقی کے محسوس ہو رہی ہے۔ ہم اس ملک کے کروڑوں انسانوں کی دل کی زبان اور جذبات کے ترجمان بن سکتے ہیں۔

حلقۂ پیام انسانیت کے نام سے ہم نے جو کام شروع کیا ہے، الحمد للہ اس کے بڑے حوصلہ افزا نتائج سامنے آ رہے ہیں، اس ملک میں ابتک یہ بات باقی ہے کہ اچھی بات کے سننے والے اور اس سے متاثر ہونے والے موجود ہیں، یہ بات ہمیں ایک موقع فراہم کر رہی ہے، ہم اس سے فائدہ اٹھائیں، بے غرض خدمت اور امن و آشتی اور اخوت و بھائی چارگی کی ایک عمومی فضا اس ملک میں قائم کرنے کے لیے میدان میں آئیں، جذباتی سیاست، گروہی عصبیت اور تماشائی ذہنیت کو ختم کریں۔ انشاء اللہ ہماری یہ حقیر لیکن مخلصانہ کوشش رنگ لائے گی اور اس ملک کے شب و روز بدلیں گے —— یہاں انسانیت کی قیمت پہچانی جائے گی۔ یہاں انسان کی قسمت جاگ اٹھے گی۔

(جاری)

ایک ضروری اعلان! دفتر تعمیر حیات کو ریکارڈ فائل کے لئے درج ذیل شماروں کی ضرورت ہے، جو خریدار یا ایجنسیاں انہیں مہیا کریں گی انہیں شکریے کے ساتھ قیمت ادا کی جائے گی۔

شمارہ ۲۵ نومبر ۱۹۷۸ء، شمارہ ۲۵ اکتوبر ۱۹۷۸ء

۱۰ و ۲۵ جنوری ۱۹۷۸ء، ۱۰ جون ۱۹۷۸ء

(منیجر)

بقیہ صفحہ ۶

کیا جائے گا۔ آخر میں انہوں نے موتمر کی غیر معمولی کامیابی پر اظہار اطمینان و مسرت کرتے ہوئے نیز اس کے کارکنان و منتظمان کی خدمات کو سراہتے ہوئے اس کی ترقی و کامیابی کی دعا فرمائی۔ آخر میں پروفیسر مشیر الحق ندوی، استاد جامعہ ملیہ اسلامیہ نے مندوبین کی جانب سے میزبانوں اور کانفرنس کے کارکنان و منتظمین کا شکریہ ادا کیا۔

موتمر کی کاروباری نشست اسی روز شام ساڑھے تین بجے منعقد ہوئی جس کی صدارت پروفیسر سید مقبول احمد نے فرمائی، سب سے پہلے راقم الحروف نے موتمر کے معتمد عام کی حیثیت سے ایک تعزیتی قرارداد پیش کی جس میں پروفیسر محمد زبیر صدیقی (سابق اسوتوش پروفیسر آف اسلامک کلچر کلکتہ یونیورسٹی) شاہ معین الدین ندوی (ناظم دار المصنفین، اعظم گڑھ) مولانا عبد الماجد دریابادی (مدیر صدق جدید لکھنؤ) پروفیسر عبد العلیم (سابق صدر شعبہ عربی و اسلامیات و وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) پروفیسر وحید مرزا (سابق صدر شعبہ عربی، لکھنؤ یونیورسٹی) اور پروفیسر میر ولی الدین (سابق صدر شعبۂ فلسفہ، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد) کی وفات حسرت آیات پر دلی رنج و غم کا اظہار کیا گیا اور اسلامیات کے لئے اسے ایک ناقابل تلافی علمی نقصان قرار دیا۔ یہ تجویز شرکاء جلسہ نے کھڑے ہو کر اور مرحومین کے لئے دعائے مغفرت کر کے منظور کی۔ یہاں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اول الذکر چار مرحومین موتمر کے رکن اعزازی تھے نیز پروفیسر محمد زبیر صدیقی اس موتمر کے دوسرے صدر اور پروفیسر عبد العلیم پہلے معتمد عام اور ساتویں صدر بھی تھے۔

ایک تجویز کے ذریعہ طے پایا کہ موجودہ اجلاس کی روداد مع مقالات شائع کی جائے اور مقالہ نگاروں سے گذارش کی جائے کہ وہ اپنے مقالات، نظر ثانی، مناسب اختصار اور ذیلی حوالوں کے اضافہ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ ۳۰ نومبر ۱۹۷۸ء تک معتمد عام کو بھیجدیں اور مجلس عاملہ ایک مجلس ادارت کی تشکیل دے جو مقالات کی تہذیب، ترتیب اور اشاعت کی ذمہ دار ہو۔

ایک دوسری تجویز کے ذریعہ طے پایا کہ موتمر عرب ممالک کے اسلامی تحقیقی اداروں سے رابطہ قائم کر کے مطبوعات و معلومات کا تبادلہ کرے۔

جلسہ نے پرزور تالیاں بجا کر انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، تغلق آباد، نئی دہلی کی اس دعوت کو منظور کیا کہ موتمر کا اجلاس نہم اس کے زیر اہتمام ۱۹۸۰ء میں منعقد ہو۔

اس جلسہ میں اجلاس نہم کے لئے موتمر کے حسب ذیل عہدہ داران و اراکین کا انتخاب اتفاق رائے سے منظور کیا گیا:-

(ا) عہدہ داران

۱۔ صدر: پروفیسر سید مقبول احمد، مدیر مرکز دراسات ایشیائے مغربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۲۔ نائب صدر: پروفیسر مشیر الحق، شعبہ اسلامیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

۳۔ معتمد عام: ڈاکٹر محمد اقبال انصاری، مدیر معہد دراسات اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۴۔ معاون معتمد: ڈاکٹر اکمل ایوبی، ریڈر شعبہ اسلامیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۵۔ خازن: ڈاکٹر محمد سالم قدوائی، شعبۂ اسلامیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

(ب) اراکین

۱۔ پروفیسر عطا کریم برق، اسوتوش پروفیسر آف اسلامک کلچر، کلکتہ یونیورسٹی، کلکتہ

۲۔ پروفیسر احتشام احمد ندوی، صدر شعبۂ عربی کالی کٹ یونیورسٹی، کالی کٹ (کیرالا)

۳۔ ڈاکٹر محمد صابر خاں (سابق فیلو انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈی شملہ) کلکتہ

۴۔ ڈاکٹر محمود الحق، ریڈر شعبہ اسلامیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۵۔ مولانا محمد رابع ندوی، استاد دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

۶۔ جناب سید اوصاف علی، سکریٹری، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، نئی دہلی۔

۷۔ جناب نظام الدین مغربی، صدر شعبۂ تاریخ، اردو آرٹس کالج، حیدرآباد

۸۔ جناب یوسف کمال بخاری، کیپر نیشنل آرکائیوز بھوپال

مرثیہ مگر کِس کا

بہ پروفیسر رشید کوثر فاروقی

(۱)

یہ کس کی قبر کا ماحول ہے چمن کی طرح
یہ کس کی قبر ہے آراستہ وطن کی طرح
یہ کس کی قبر ہے، خاصان خاص کہیے جسے
یہ کس کی قبر پہ گویا برات آئی ہے
یہ کس کی قبر پہ بکھری ہوئی ہے افشاں سی
یہ کس کی قبر پہ اترے ہیں مہر و ماہ و نجوم
یہ کس کی قبر سے پرواز عود و عنبر ہے
یہ کس کی قبر ہے نکہت فروش و گل بکنار
یہ کس کی قبر پہ نیر چکاں ہیں قندیلیں
یہ کس کی قبر پہ زردوز کا کمال نثار
یہ کس کی قبر ہے، جس کی طرف کریں گے نہ پیٹھ
یہ کس کی قبر ہے، جس کو کہیں گے اب درگاہ
یہ کس کی قبر پہ آنے لگے ہیں فاتحہ خواں
یہ کس کی قبر پہ تجویز پاسبانی ہے
یہ کس کی قبر پہ خنیاگروں کی محفل ہے
یہ کس کی قبر سرود و سخن کی منزل ہے

(۲)

یہ کس کی شان میں چھپتے ہیں تعزیت نامے
یہ کس کی یاد میں طغرا طراز ہیں خامے
یہ کس کی شان میں نکلے مجلّہ ہائے ضخیم
یہ کس کی یاد میں لکھتے ہیں مرثیے شاعر
یہ کس کی شان میں روشن ہیں جدولیں آخر
یہ کس کی یاد میں برپا ہے رقص ماتمیاں
یہ کس کی شان میں یلغار ہے قصیدوں کی
یہ کس کی یاد میں ہیں سر بجیب نوحہ نگار
یہ کس کی شان میں رطب اللساں ہیں انجمنیں
یہ کس کی یاد میں روشن ہے قمقموں کی قطار
یہ زور یاد بہ عنوان تازہ کس کی ہے
یہ بار بار نماز جنازہ کس کی ہے

(۳)

یہی تو تھا کہ تو جس سے آشنا بھی نہ تھا
یہی تو تھا کہ اسے کوئی پوچھتا بھی نہ تھا
اٹھی نگاہ بھی اس پر تو از رہ تحقیر
غریب شہر کی باتیں شنیدنی بھی نہ تھیں
طلا و نقرہ و گوہر تو کوئی کیا دیتا
کسی نے پیار کا تحفہ کبھی نہ پیش کیا

ہزار کاندھوں پہ جس کا جنازہ تخت نشیں
اس کے گھر میں فقیرانہ بوریا بھی نہ تھا
یہ مر گیا تو لحد پر گگن محل اٹھے
یہ زندہ تھا تو اسے گوشۂ سکوں نہ ملا
یہ آج جس کے لیے کاغذی دعائیں ہیں
اسی پہ متصلاً گالیوں کے تیر چلے
تلاش عیب بھی تھی، تہمتیں بھی تھیں مگر آج
مبالغے ہیں، محاسن کی جستجوئیں ہیں
پڑوسیوں پہ عیادت بھی بار ہوتی تھی
نگر نگر ہے کہ اب تعزیت کو حاضر ہے
غیور تھا تو بہت کبر و شان ہنستے تھے
زمین تھا تو بہت آسمان ہنستے تھے

(۴)

اسی کا گھر ہے جہاں بے قراریاں ہیں مقیم
اسی کا گھر ہے جہاں خون رو رہے ہیں یتیم
زمین گور غریباں کا ہے گماں جس پر
اسی کے لال جہاں زندہ دفن ہیں گویا
کوئی نہیں جو انہیں بے طلب مصارف دے
کوئی نہیں جو انہیں پیار دے، بلائیں لے
کوئی نہیں جو بنائے انہیں عریس و عروس
کوئی نہیں جو سراپا دعا ہو ان کے لیے
اسی کا گھر ہے جہاں بیوگی کے سناٹے
پکارتے ہیں مگر کوئی سن نہیں سکتا
کسی کو اپنی کہانی سنا نہیں سکتے
کسی کو اپنا دکھا دل دکھا نہیں سکتے
کسی سے کہہ نہیں سکتے کہ درد کیسا ہے
جو کہہ سکیں بھی تو کوئی سمجھ نہیں سکتا
سمجھ بھی لے تو دوا کون دینے والا ہے
حیات کیا ہے نہیں ہے اگر شریک حیات
پدر کا سایہ نہیں ہے تو کودکی کیا ہے
وہاں تو قبر پہ صدہا چراغ جلتے ہیں
یہاں اندھیروں میں سینوں کے داغ جلتے ہیں

(۵)

معاصرین سے نفرت میں بے مثال ہیں ہم
گذشتگاں سے عقیدت میں لازوال ہیں ہم
ہمیں نے حضرت عثمانؓ کو شہید کیا
ہمیں نے ان سے جو قاتل نہ تھے قصاص لیا
ہمیں نے قتل علیؓ کو شعار دیں سمجھا
ہمیں علیؓ کو "علیہ السلام" لکھتے ہیں
ہمارے ہاتھ جو ہیں شغل سینہ کوبی میں
لہو حسینؓ کا ان سے ٹپک رہا ہے ابھی
ہمیں اڑاتے تھے ٹھوکر پہ ابن حنبلؒ کو
ہمیں نے ان کو خطاب امام وقت دیا
ہمیں نے عافیت ابن تیمیہؒ لوٹی
ہمیں نے ان کے جنازے میں ازدحام کیا
ہمیں نے دار پہ قطب شہیدؒ کو کھینچا
ہمیں ہیں مقتل اخوانیاں پہ نالہ کناں
جو اصل غم ہے وہی غم کوئی نہیں کرتا
ہماری عقل کا ماتم کوئی نہیں کرتا

(۶)

بلندیوں سے گریزاں ہیں، پست قوم ہیں ہم
ہمیں ہے فخر کہ مردہ پرست قوم ہیں ہم
جو قدر چاہتے ہو، جان سے گذر جاؤ
اگر پسند ہو جینا تو پہلے مر جاؤ
یہ قوم وہ ہے جو زندوں کی جان لیتی ہے
یہ قوم وہ ہے جو مُردوں پہ جان دیتی ہے
یہ قوم تودۂ خاکی کے بت بناتی ہے
یہ قوم قبر کی مٹی بھی بیچ کھاتی ہے
یہ مر چکی ہے اسے گور زندگی رکھ دو
عجائبات میں اس قوم کی ممی رکھ دو

نعتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم

نتیجۂ فکر: ڈاکٹر ریاض الحسن، ۳۲ - بھیرو بجی روڈ، لکھنؤ

متاع درد دلِ داغدار لاتے ہیں
ترے حضور میں جو بے قرار آتے ہیں
جنھیں سعادتِ عقبیٰ کی فکر ہوتی ہے
وہ اٹھتے بیٹھتے لیل و نہار آتے ہیں
نہ جانے کتنے درود و سلام کے تحفے
ترے غلام لیے بار بار آتے ہیں
یہ اشکہائے مسرت ہیں سب کا زادِ سفر
انہیں کو لے کے سب اے تاجدار آتے ہیں
ملائکہ ہوں کہ انساں، درود پڑھتے ہوئے
ریاضؔ آتے ہیں پروانہ وار آتے ہیں

دیگر

سارے نبیوں کے نبی سارے اماموں کے امام
پیش کرتا ہوں بہ صد شوق و ادب اپنا سلام
یا خدا مجھ کو بنا دے تو بلالِ حبشیؓ
مجھ کو دنیا جو پکارے تو محمدؐ کا غلام
یا خدا خیر کہ اب تیرے نبی کی امت
کر چکی دل سے فراموش نبی کا پیغام
کون ہے اس سے بڑی اور سعادت کہ ریاضؔ
تو جو بن جائے محمدؐ کے غلاموں کا غلام

پرنٹر، پبلشر، مسئول سید محمد حسنی نے جے۔ کے آفسیٹ پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر "تعمیر حیات" ندوہ لکھنؤ سے شائع کیا۔

اڈیٹر: اسحٰق جلیس ندوی

مولانا محمد علی جوہرؒ

جنہوں نے ۴ جنوری کو جان جاں آفریں کے سپرد کی۔ جس مجاہد آزادی کو آج ملک نے فراموش کر دیا۔

بیت المقدس پر یہودیوں کے تسلط اور اس مقدس مقام کا مسلمانوں کے ہاتھ سے چھن جانے کا ایک دردناک پہلو یہ ہے کہ ہندوستان کی جنگ آزادی کے مجاہد اور تحریک خلافت کے رہنما مولانا محمد علی جوہرؒ یہیں مدفون ہیں۔ موصوف گول میز کانفرنس میں شرکت کیلئے لندن تشریف لے گئے۔ صحت انتہائی خراب تھی۔ ڈاکٹروں اور تیمار داروں نے سفر ملتوی کرنے کا مشورہ دیا مگر ہندوستان کو آزاد و مختار ملک کی حیثیت سے دیکھنے کی ان کی خواہش انہیں کشاں کشاں لندن لے گئی۔ اس کانفرنس میں آپ نے ایک تاریخی تقریر کی اور اسی موقع پر وقت آخر آپہونچا۔ وفات لندن میں ہوئی اور تدفین بیت المقدس میں۔ آپ کی مزار پر آج بھی یہ شعر کندہ ہے ۔

زندگی میں تو نہ کام آئے مگر
مرکے جوہر آپ کے جوہر کھلے

(ادارہ)

ولادت تو مادر زاد ہوتی ہے۔ لیکن محمد علی جوہرؒ کی موت خانہ زاد تھی۔ عام طور پر موت اپنا انتخاب خود کرتی ہے۔ لیکن محمد علیؒ نے موت کا خود انتخاب کیا اور یہی وہ چیز ہے جس نے محمد علی کی زندگی اور موت دونوں کو ایک برگزیدہ حقیقت بنا دیا............ سنگین اور صالح......

محمد علی کی زندگی اور موت دونوں ان کی انفرادی اور شخصی افتاد طبع کی ایک جلوہ گری تھی۔ اور شخصیت کی ایسی جلوہ گری کا نام آرٹ ہے...... صحیح اور گراں مایہ.........

محمد علی کی زندگی کے مختلف نشیب و فراز تھے۔ کسی کی زندگی میں نہیں ہوتے۔ لیکن انکی موت نے ہر نشیب کو فراز اور ہر فراز کو پر شوکت بنا دیا۔

محمد علی کو بد توفیقوں اور بد مذاقوں سے سابقہ پڑا۔ ایسے بد توفیق اور بد مذاق جو بھو کے تھے۔ بوالہوس اور کینہ پرور بھی......... محمد علی نے ان سب سے انتقام لیا۔ لیکن اپنی زندگی میں نہیں بلکہ اپنی موت سے!

محمد علی کے باب میں بعض کہتے ہیں کہ وہ بڑے تھے۔ لیکن ان کا کوئی کارنامہ نہیں۔ یہ تنگ دلوں اور تنگ نظروں کا فیصلہ ہے۔ ہماری قومی زندگی میں آج کتنے دھارے بہہ رہے ہیں۔ کتنے چشمے ابل رہے ہیں! کتنے عزائم بیدار......... کتنے دار و رسن کے طلبگار ہیں۔ یہ کس کا فیضان ہے۔ محمد علی نے ہمارے خون کو رگوں میں دوڑنا پھرنا ہی نہیں بتایا۔ بلکہ وہ خود ہماری آنکھوں سے خون بن کر ٹپک رہے ہیں۔

مرد غازی کے کارناموں کا اندازہ مقبوضات کی وسعت، مال غنیمت کی فراوانی، جشن و جلوس کی ہماہمی و طرب انگیزی بر گستوان کی زینت تمغہ اور اسلحہ کی چمک سے نہیں کیا جاتا۔ بلکہ اس کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ ٹوٹی ہوئی تلوار، بکھری ہوئی زرہ، بہتے ہوئے لہو، دہلتی ہوئی روح اور دمکتے ہوئے چہرے......... ڈوبتے ہوئے سورج سے.........

محمد علی کا قلب حزیں تھا۔ لیکن روح تابندہ و تپاں......... بشارت ازلی بھی......... حزیں یوں کہ جن کو وہ محبوب رکھتے تھے وہ بھی ان کے مخالف تھے۔ کیسی مخالفت۔ اصولی نہیں بلکہ اکثر ذاتی مفاد، نفس پروری اور تن آسانی کے لئے......... وہ ایک شیر کی مانند تھے۔ جن کو شیروں سے نہیں، لومڑیوں اور بھیڑیوں سے سابقہ ہو۔

محمد علی کی ذہانت اب کہاں ملے گی۔ وہ تیغ اصیل۔ جو رزم میں بے پناہ تھی اور بزم میں جلوہ گر تھی۔ وہ مخالفت اور مقابلے میں بے باک اور بے پناہ تھے۔ وہ چھوٹوں پر شفقت کرتے تھے اور ان کو پناہ دیتے تھے۔ ان کی دلدہی اور دل آسائی ان کے لئے مرنے مارنے پر تیار رہتے تھے۔ محمد علی کی آغوش میں رحمت تھی۔ ان کی مدد لینے کے معنی یہ تھے کہ اب ساری ذمہ داری، ساری فلاکت و ہلاکت محمد علی کی اور کامیابی یا شہرت مدد لینے والے کی۔ وہ آغوش مادر، بازوئے برادر اور راحت عزیز تھے۔

کس بلا کے بولنے والے اور لکھنے والے تھے۔ بولتے تو معلوم ہوتا ابوالہول کی آواز اہرام مصر سے ٹکرا رہی ہے۔ لکھتے تو معلوم ہوتا کہ کرپ کے کارخانے میں توپیں ڈھل رہی ہیں۔ یا پھر شاہجہاں کے ذہن میں تاریخ کا نقشہ مرتب ہو رہا ہے۔ میں نے ان کو اسٹیج پر آتے اور بولتے ہوئے سنا ہے۔ اور خود محمد علی کو داد دینے سے پہلے انیس کو داد دی ہے ؎

"ضیغم ڈکارتا ہوا نکلا کچھار سے"

محمد علی پر دولت، شہرت کی بارش ہوئی۔ محمد علی نے ان دونوں کو سیلاب بنا کر بہا دیا۔ بدنامی اور مفلسی سے بھی سابقہ پڑا لیکن یہ چیزیں جسم و جان کی تھیں۔ ان کی روح پاک تھی۔ بوریائے بوذرؓ اور تخت سلیماں کو یکساں سمجھنے والے کی موت آخر کیا شہادت دیتی ہے۔

محمد علی کی موت کا حال جب میں نے سنا تو تھوڑی دیر کے لئے یقین نہیں آیا۔ رہ رہ کے یہ خیال آتا رہا کہ محمد علی کو موت نے زیر کس طور پر کیا۔ خود موت پر کیا گذری ہوگی۔

ملک و ملت کی جنگ اب بھی جاری ہے۔ لیکن نعرۂ جنگ خاموش ہے۔ فتح و شکست تو اسی لئے بنائے گئے ہیں کہ فتح و شکست ہوتی رہے۔ لیکن جنگ آزما کہاں ہیں۔ شہادت کس کو نصیب ہوگی۔ ایسا حسین کہاں جس کی خونریزی کو تلاش ہو۔ آئیے جہاں کل فاتح بیت المقدس نے سر جھکایا تھا وہاں آج محمد علی کی معراج منائیں۔ اللہ اکبر وللہ الحمد۔

(پروفیسر رشید احمد صدیقی)

> عزیزی! میں تم سے کیا کہوں۔ میں نے محمد علی کا چہرہ اس قدر خوبصورت کبھی نہیں دیکھا۔ میٹھی نیند۔ اطمینان سے جیسے کوئی سوتا ہے۔ آخری وقت میں ذرا بھی تکلیف نہ تھی۔ سکون تھا۔ مسلمان تھا، مسلمان کی موت اس کفرستان میں مرا۔ اور تمام ملک والوں سے خراج تحسین وصول کیا۔
>
> لندن کے سب ہندو اور مسلمان آتے تھے اور زیارت کر کے چلے جاتے تھے۔ گول میز کانفرنس کے سب ممبران باری باری آتے تھے ۔ آج صبح میت جہاز پر رکھی گئی۔ مفتی اعظم فلسطین کی دعوت اور تمام برادران وطن کی دعوت پر مسجد اقصیٰ میں دفن کا قصد کیا گیا تاکہ ہندوستان کے مسلمانوں کے تعلقات برادران عرب سے وابستہ ہو جائیں۔
>
> (مکتوب مولانا شوکت علی)

> "کیا کہا۔ ہم ہندو آزادی کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں قربانیاں دے رہے ہیں اور ہم انگریزوں کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں۔ ہم وہ خلافت کمیٹی تھی جس کے سرمائے سے گاندھی نے سارے ہندوستان کا دورہ کیا۔ وہ ہم تھے جنہوں نے کانگریس کو لبرلوں سے چھینا اور آزادی کے راستے پر لے آئے۔ وہ ہم تھے جنھوں نے ہندوؤں میں سیاسی شعور بیدار کیا، گاندھی کو مہاتما گاندھی بنایا۔ قربانیاں ہم نے کیں۔ ہم نے اپنی جائدادیں نیلام کرائیں، گھر کے برتن قرق کرائے۔ نوکری چھوڑی۔ پریس ضبط کرایا۔ اخبار بند کرایا۔ جیل گئے۔ پھانسی کا پھندہ ہماری گردنوں کے لئے تیار ہوا۔ موتی لال نہرو آج بھی چیمبر پریکٹس کر کے ہزاروں ماہوار کما رہے ہیں۔ جواہر لال کے حصے نہ جانے کتنے بینکوں، فرموں، کمپنیوں اور کارخانوں میں ہیں جنکا نفع ہر مہینے ان کی جیب میں چلا جاتا ہے۔ گاندھی جی کو ان کی قوم لاکھوں روپئے دے رہی ہے اور پوچھتی بھی نہیں کہ اس رقم کا کیا کر رہے ہو۔ لیکن ہمارا کسی کمپنی میں حصہ نہیں ہے۔ ہمارے پاس کوئی سرمایہ نہیں ہے۔ ہم ہیں پورس کے ہاتھی ہیں جو ہمارا راستہ روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمیں انگریز نہیں خرید سکا۔"
>
> (تقریر مولانا شوکت علی)

ندوۃ العلماء

منزل بہ منزل

قسط ۱۱

ندوۃ العلماء کا پانچواں اجلاس
منعقدہ — کانپور
۸،۷ر مارچ ۱۸۹۸ء

ان سب باتوں پر غور کرنے سے بآسانی یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ چار برس کے عرصے میں ندوۃ العلماء نے جو کچھ قبولیت حاصل کر لی ہے وہ کچھ کم نہیں ہے اس سے ہم امید کر سکتے ہیں کہ ندوۃ العلماء کے ارکان اگر مستعدی و جانفشانی سے کام کرتے رہے تو ایک زمانے میں انشاء اللہ تعالیٰ تمام تعلیمی و اخلاقی نقائص دفع ہو جائیں گے اور مسلمانوں کو روحانی زندگی حاصل ہوگی۔

اجلاس میرٹھ کی تجاویز کا جائزہ:

ندوۃ العلماء کا جو کام ہے وہ کبھی اس سے غافل نہیں رہا چنانچہ سال زیر بیان میں اس نے جو کوششیں کی ہیں ان کو میں علی الترتیب بیان کرتا ہوں۔

پہلی تجویز جلسۂ عام میرٹھ میں یہ منظور ہوئی تھی کہ انگریزی خواں طلباء کو وظائف دے کر عربی اور دینیات کی تعلیم دی جائے تاکہ وہ اصول و عقائد سے واقف ہو کر ندوے کی طرف سے غیر ممالک میں اشاعت اسلام کے لیے بھیجے جائیں۔ جلسہ انتظامیہ منعقدہ ۲۶ر محرم ۱۳۱۵ھ میں یہ طے ہوا تھا کہ چونکہ ندوۃ العلماء نے اپنے خاص اہتمام سے اب تک کوئی مدرسہ جاری نہیں کیا اس لیے بالفعل ایسے طلبہ کا مدارس اسلامیہ میں سے کسی مدرسے میں انتظام کیا جائے مگر مدارس اسلامیہ کے حالات کو دیکھنے سے معلوم ہوا کہ وہ اس قسم کی تعلیم و تربیت کے لئے آمادہ نہیں ہیں جس طرح ندوۃ العلماء چاہتا ہے، اس لیے اس سال اس تجویز کو عمل میں لانے کی کوئی تدبیر نہیں ہو سکی، اب اس جلسے میں اس بحث کو پیش کرنا چاہتا ہوں کہ ندوۃ العلماء کو ان کی تعلیم و تربیت کے لیے مستقل انتظام کرنا چاہیئے، ورنہ اس تجویز کا نفاذ عملی صورت میں نہ ہو سکے گا۔

دوسری تجویز یہ منظور ہوئی تھی کہ چند مستعد اور ذکی طالب علموں کو تکمیل علوم و فنون کی غرض سے وظائف دے کر مصر بھیجا جائے لیکن مجبوراً اس تجویز کو سر دست ملتوی کر دیا ہے۔

تیسری تجویز یہ منظور ہوئی تھی کہ تجویز اشاعت الاسلام کی کاروائی بالفعل اس طریقے سے شروع کر دی جائے کہ چند واعظ اُن اضلاع میں مقرر کئے جائیں جہاں کے باشندے احکام اسلام سے ناواقف ہیں اس تجویز کے موافق اس سال چار واعظوں کا تقرر منظور ہوا تھا مگر چند ہی روز میں ایسے اسباب پیش آگئے جن کی وجہ سے ملک میں ایک قسم کی شورش پیدا ہوگئی اور ہر کام میں بدگمانی ہونے لگی اس لیے مجبوراً اس تجویز کو اس وقت تک ملتوی کیا گیا جب تک کہ ارکان انتظامی اس کو مناسب سمجھیں۔

چوتھے علاوہ ان تجویزوں کے جو سال گزشتہ میں منظور ہوئی تھیں ندوۃ العلماء کو اس سال دارالعلوم کے لیے سرمایہ جمع کرنے کا کام تھا اس کی نسبت جلسہ انتظامیہ منعقدہ ۲ر محرم ۱۳۱۵ھ میں یہ طے ہوا کہ خاص اس کام کے لیے ندوۃ العلماء کی طرف سے وفود روانہ کئے جائیں جو ملک میں جا بجا دورہ کریں۔

پانچویں، ندوۃ العلماء کی تیسری تجویز دارالافتاء ہے اس میں اس سال زیادہ کوشش کی گئی اور بہ نسبت سالہائے گذشتہ کے اس سال زیادہ فتوے مرتب کئے گئے۔

چھٹے، ندوۃ العلماء کی نگرانی میں ۳ر شوال ۱۳۱۳ھ میں جو یتیم خانہ اسلامیہ کھولا گیا تھا اس کی طرف اس سال خاص توجہ کی گئی اب بفضلہ تعالیٰ وہ روز بروز ترقی کرتا جاتا ہے۔

ساتویں، اس سال بھی مجلسہائے ماتحت کے قائم کرنے سے پہلو تہی نہیں کی گئی، اورنگ آباد ضلع گیا میں ایک مجلس معین الندوہ کے نام سے قائم ہوئی ہے۔

آٹھویں، ارکان کی تعداد اس سال کے بہ نسبت سال گذشتہ کے بہت زیادہ ہوگئی ہے۔

نویں، ندوۃ العلماء کے مقاصد و فوائد کی اشاعت کے لئے اس سال دورے نہیں کئے گئے مگر خط و کتابت سے جہاں تک ہو سکتا تھا اس میں دریغ نہیں کیا گیا۔

بشری طاقتوں کا مجموعہ:

حضرات! ندوۃ العلماء کو یاروں نے اگر کیمیا گر سمجھ لیا تھا تو یہ ان کی خوش فہمی ہے اور اگر اس کو زیادہ سے زیادہ بشری طاقتوں کا ایک مجموعہ خیال کیا تھا تو بے شک طاقت بشری کے موافق ندوۃ العلماء بہت کچھ کر رہا ہے اور کرے گا اور خدا کو منظور ہے تو اس کی تجویزیں ایک دن پوری ہو جائیں گی اور اگر خدانخواستہ پوری نہ ہوئیں تو بھی ہم نے اپنا فرض ادا کیا اور بقدر ہماری نیتوں کے اس کا ہم کو ثواب ملے گا۔

تجویز مقام دارالعلوم:

مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی رئیس بھیکن پور نے تحریک پیش کی کہ دارالعلوم بجائے دہلی کے لکھنؤ میں قائم کیا جائے اس تحریک کو پیش کرتے وقت مولوی صاحب ممدوح نے مندرجہ ذیل تقریر کی۔

حضرات! ندوۃ العلماء کو قائم ہوئے اب کئی برس ہو گئے اور اس کے اجلاسوں میں متعدد تجویزیں بھی منظور ہوئیں، لیکن افسوس ہے کہ اس وقت تک ان تجاویز کے متعلق ایسی کارروائی عمل میں نہیں لائی گئی جو ان کی شان کے مناسب ہے۔

ندوۃ العلماء نے جو تجویزیں پیش اور پاس کی ہیں ان میں سب سے زیادہ مہتم بالشان دارالعلوم قائم کرنا ہے۔ معہذا اشاعت الاسلام کے متعلق کارروائی بعض مصالح کی بنا پر ملتوی بھی رکھی گئی ہے، پس میرے خیال میں اس جلسے کو اور تمام ارکان ندوۃ العلماء کو اپنی توجہ دارالعلوم کی جانب مبذول فرمانی، لازم ہے گذشتہ سالانہ جلسے میں یہ امر بحث کے واسطے پیش تھا کہ دارالعلوم کہاں قائم کیا جائے اور کسی قدر بحث کے بعد یہ قرار پایا تھا کہ دہلی میں دارالعلوم قائم ہو۔

حضرات! ہر بات کی خاص خاص تشکیلیں اور ہر کام کے خاص خاص ساز و اسباب ہوتے ہیں، ہمارا دل چاہتا ہے کہ دارالعلوم دہلی میں ہو مگر سال بھر گذر لینے پر بھی ہم اپنی تحریکوں کا اثر دہلی میں نہیں پاتے اور ہم میں سے اکثر وہاں عملی کارروائی کرنے سے قاصر ہیں اور حق یہ ہے کہ جب تک متفقہ کوشش اس کام میں جانفشانی نہ کرے اس وقت تک دو چار ارکان اگر کیسے ہی ذی اثر اور وقیع کیوں نہ ہوں اس بار عظیم کے متحمل نہیں ہو سکتے اور بے شک ان کے سر اتنا بڑا بوجھ رکھ دینا انصاف سے بعید ہے، یہ اسباب ہم کو بے دست و پا سا کر رہے ہیں کہ ہم کو فوراً عملی کارروائی شروع کر دینے کی ضرورت ہے لہذا میں رائے دیتا ہوں کہ دارالعلوم کے قیام کے لیے ہم کو افسوس و حسرت کے ساتھ شاہجہاں آباد سے اپنا خیال ہٹا لینا چاہیئے اور دوسرا

(بقیہ صفحہ پر)